جہانِ غالب
17

جہانِ غالب

یادگار حکیم عبدالحمیدؒ

جلد: 9 شمارہ۔ 17

نگراں

پروفیسر شمیم حنفی

مدیر

ڈاکٹر عقیل احمد

غالب اکیڈمی، بستی حضرت نظام الدین، نئی دہلی

جہانِ غالب

یادگار حکیم عبدالحمیدؒ

جلد:9　　　شمارہ:17　　　دسمبر2013 تا مئی 2014ء

قیمت فی شمارہ:-/20 روپے

قیمت سالانہ:-/40 روپے

ڈاک سے: -/50 روپے

کمپوزنگ: بشریٰ بیگم

طابع و ناشر

ڈاکٹر عقیل احمد

سکریٹری: غالب اکیڈمی

بستی حضرت نظام الدین، نئی دہلی۔110013

فون نمبر:9868221198, 24351098

ای میل:ghalibacademy@rediffmail.com

ویب سائٹ:www.ghalibacademy.org

پرنٹر، پبلشر ڈاکٹر عقیل احمد نے غالب اکیڈمی کی طرف سے ایم آر پرنٹرس 2816 گلی گڑھیا، دریا گنج، نئی دہلی سے چھپوا کر غالب اکیڈمی 168/1 بستی حضرت نظام الدین نئی دہلی 13 سے شائع کیا۔ ایڈیٹر: عقیل احمد

فہرست

اس شمارے میں

جہان غالب کا سترہواں شمارہ پیش خدمت ہے۔ ہندو پاک میں منٹو صدی بڑی دھوم دھام سے منائی گئی۔ غالب ادب کا ایسا موضوع ہے جس کا رشتہ ہر قلم کار سے جڑ جاتا ہے۔ منٹو کا بھی غالب سے قریبی رشتہ ہے۔ غالب پر بننے والی فلم کی اسکرپٹ منٹو نے لکھی اور منٹو نے اپنی کہانیوں کے نام بھی غالب کے اشعار سے اخذ کئے ہیں۔ غالب اکیڈمی میں بھی منٹو اور غالب کے عنوان سے ایک لیکچر کا اہتمام کیا گیا جس میں پروفیسر شمس الحق عثمانی نے بہت پر مغز مقالہ پیش کیا وہ جہان غالب کے قارئین کے لیے پیش ہے۔ دوسرا مضمون ڈاکٹر ابرار رحمانی کا غالب پر کلیم الدین احمد کی ایک نظر ہے۔ جس میں انھوں نے کلیم الدین احمد پر غالب تنقید سے بحث کی ہے۔ تیسرا مضمون ڈاکٹر زیبا محمود کا ہم سے بے علموں کو غالب سے کیا نزدیک تر ہے جو شمس الرحمٰن فاروقی کی کتاب تفہیم غالب سے متعلق ہے۔ علیم صبا نویدی نے اردو رباعی کے عنوان سے ایک مضمون بذریعہ ڈاک بھیجا اور ڈاکٹر جاویدہ حبیب نے غالب کے ایک معاصر شاعر لطیف آرکاٹی پر ایک مضمون بھجوانے کی زحمت کی یہ دونوں مضامین شامل اشاعت ہیں۔

غالب اپنی بذلہ سنجی کے لیے بہت مشہور ہیں۔ جسے ان کی حاضر جوابی، برجستہ گوئی اور لطیفہ گوئی بھی کہا جاتا ہے۔ ان کی برجستہ گوئی کا اظہار خطوط میں زیادہ ہوا ہے۔ غالب اکیڈمی کی لائبریرین بشریٰ بیگم کا ایک مضمون غالب کی برجستہ گوئی شامل اشاعت ہے اس میں غالب کے لطیفے یکجا کردیے گئے ہیں۔ جو عام قاری کے لیے دلچسپی کا باعث ہوں گے۔ غالب اکیڈمی ہر مہینے ایک ادبی نشست کا اہتمام کرتی ہے ان میں بعض اچھے مضامین پڑھے جاتے ہیں۔ گزشتہ

ایک نشست میں جناب ریاض قدوائی نے اودھ کی تہذیب پر ایک مضمون پڑھا تھا جس میں خاص طور سے ناطق لکھنوی کا خصوصی مطالعہ پیش کیا یہ مضمون بھی معلوماتی اور دلچسپ ہے۔

خواجہ میر درد پر ایک تعارفی مختصر مضمون اور ادبی سرگرمیوں کے ساتھ یہ شمارہ پیش خدمت ہے۔ یہ شمارہ اور شماروں سے ذرا مختلف ہے اس میں اکثر مضامین ہلکے پھلکے ہیں جو قارئین کے لیے دلچسپ ثابت ہوں گے۔ امید ہے کہ گزشتہ شماروں کی طرح یہ شمارہ بھی پسند کیا جائے گا۔

✡✡✡
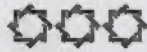
غالب اور منٹو

غالب اور منٹو، اب، نام نہیں، استعارے ہیں۔ اِن کا خمیر انسانی جذبات واحساسات کی فہم اور پاس داریِ فن کی مساوی قوتوں سے اٹھا ہے۔

غالب کے درجِ ذیل اشعار نے کئی ادب فہموں کو اُن قوتوں سے آگاہ کیا ہے جو کفیتِ غالب میں اساسی اہمیت کی حامل ہیں:

یک ذرّۂ زمیں نہیں بے کار باغ کا
یاں جادہ بھی فتیلہ ہے لالے کے داغ کا

بخشے ہے جلوۂ گل ذوقِ تماشا غالب
چشم کو چاہیے ہر رنگ میں وا ہوجانا

اِک ذرا تامل برتیں تو کُھلتا ہے کہ منٹو نے بھی زمیں پہ قدم رنجہ مخلوقات کی جملہ کیفیتوں کو مشاہدہ وتخیل سے نہار نہار کر، اپنے خلاق وجود کو وہ بصیرت و چابک دستی عطا کی تھی جو گل ولالہ کا پور پور ظاہر اور ذرّہ ذرّہ باطن، لفظوں میں ڈھال دیتی تھی۔

غالب اور منٹو کے نمایاں ترین وسائل اظہار، غزل اور افسانہ، میں فقیہانِ ادب

کے نزدیک تو ''عالمِ پاک'' اور ''خاک'' جیسی ''نسبت'' ہے— مگر افسانے کو بھی شعر کی طرح پڑھنے والے، غیر مشروط ذہن وحواس، راجندر سنگھ بیدی کی طرح، اب اُس حقیقت کو کچھ کچھ سمجھنے لگے ہیں جو بیدی نے، تخلیقی زندگی کے تقریباً چالیس برس گزارنے کے بعد، اِن لفظوں میں بیان کی تھی:

''افسانے اور شعر میں کوئی فرق نہیں۔ ہے، تو صرف اتنا کہ شعر چھوٹی بحر میں ہوتا ہے اور افسانہ ایک ایسی لمبی اور مسلسل بحر میں جو افسانے کے شروع سے لے کر آخر تک چلتی ہے۔ مبتدی اس بات کو نہیں جانتا اور افسانے کو بحیثیتِ فن، شعر سے زیادہ سہل سمجھتا ہے...'' (۱)

یہ وہی راجندر سنگھ بیدی ہیں، جنھیں منٹو نے اپنا ہم نفس محسوس کرتے ہوئے، احمد ندیم قاسمی کو نصیحت کی تھی:

''یہ راجندر سنگھ صاحب بیدی کون ہیں؟ — یہ بھی ''مٹی کے ڈھیلے'' معلوم ہوتے ہیں۔ خوب لکھتے ہیں۔ ان کے افسانے آپ غور سے پڑھا کریں...'' (۲)

تخلیقی زندگی کے تیرھویں برس، مجموعہ ''ٹھنڈا گوشت'' کے پیش لفظ میں منٹو نے افسانہ کے بارے میں لکھا تھا:

''... اِس صنفِ ادب کو میں بہت سنگین سمجھتا ہوں...'' (۳)

بیدی اور منٹو جیسے فنکاروں کی دنیا میں، بے غرضانہ، زندگی بسر کرنے والے: محمد حسن عسکری، شمیم حنفی اور وارث علوی جیسے، قارئینِ ادب، محسوس کر چکے ہیں کہ ان فنکاروں نے، اپنی منتخبہ صنفِ نثر میں، جابجا، وہ اشاریت وایمائیت، وہ ایجاز واختصار، وہ فسوں خیزی، وہ بصیرت افروزی اور زمان ومکاں سے وہ ماورائیت خلق کی ہے جو عرفِ عام میں صرف شاعری کا امتیاز کہی جاتی ہے۔ 'عرفِ خاص' کو تو اب کچھ کچھ احساس ہو چلا ہے کہ ''گلزارِ نسیم'' کے دیا شنکر نسیم اور ''ایران میں اجنبی'' کے کینٹوز والے ن۔م۔راشد؛ منٹو اور بیدی کے وہ پیش رو ہیں جو وسعتِ معنی اور تاثیرِ بیان کے وسیلوں پر کسی مخصوص صنفِ ادب کا اجارہ تسلیم نہیں کرتے۔

آئندہ سطور میں پروفیسر شمیم حنفی کی ایک تحریر کا اقتباس درج ہے جس میں، غالب اور منٹو کی اختیار کردہ اصنافِ سخن کے اختلاف سے بلند ہوکر، دونوں فنکاروں کی ذہنی یگانگت کا احاطہ کیا گیا ہے۔ یہ تحریر پچھلے دنوں (۱۰ر ستمبر ۲۰۱۲ء) علی گڑھ میں منعقدہ منٹو صدی سمینار میں کلیدی خطبے کے طور پر پیش کی گئی تھی۔ اِس تحریر کو منٹو فہمی کے اُس باب کا حرفِ آخر کہا جا سکتا ہے جس کا آغاز محمد حسن عسکری سے ہُوا اور جس میں ممتاز شیریں و وارث علوی نے گراں قدر اضافے کیے:

''پریم چند کی برگزیدگی اور منٹو کے ممتاز معاصرین کے ساتھ ساتھ آزادی، تقسیم، فسادات اور ہجرت کے پس منظر سے نمودار ہونے والے معروف ناموں (قرۃ العین حیدر، انتظار حسین، عبداللہ حسین) کی چمک دمک کے باوجود؛ اردو فکشن کے حوالے سے بیسویں صدی، بنیادی طور پر منٹو کی صدی ہے، اسی طرح جیسے سر سید اور ان کے انتہائی نام ور رفیقوں کی موجودگی کے باوجود، ہماری ادبی روایت کے تناظر میں انیسویں صدی، غالب کی صدی تھی۔ غالب اپنے معاشرے کے لیے بیگانہ (outsider) تھے، منٹو کے ساتھ بھی اس کے معاشرے نے پرائے اور بھٹکے ہوئے لوگوں کے جیسا سلوک کیا۔

میرا خیال ہے کہ غالب سے منٹو کی ارادت اور دل چسپی صرف شخصی اور جذباتی نہیں تھی۔ محض اتفاقیہ بھی نہیں تھی۔ یہ معاملہ کچھ معنوں میں دو نابغۂ روزگار لکھنے والوں کی ذہنی مماثلت اور یگانگت کا بھی تھا۔ غالب کی شخصیت کا سب سے اہم پہلو، ان کا اپنے ماحول کی طرف انکار اور آزادہ روی کا رویّہ ہے۔ وہ چون و چرا بہت کرتے ہیں۔ ان کی سی من مانی کرنا ہر کسی کے لیے ممکن نہیں۔ انیسویں صدی کے ہندوستانی معاشرے میں غالب سب سے الگ کھڑے ہیں۔ انیسویں صدی کی مجموعی حسیت اور اسلوب زیست کو عبور کرتے ہوئے، غالب عالمی ادب کے ان مشاہیر کی صف (پشکن، بودلیر، ہائنے، والٹ وہٹمن) میں جا شامل ہوئے جو بہ ظاہر اجنبی زمینوں اور زمانوں کے دریچے سے انسانی تاریخ اور تجربے کا تماشا دیکھ رہے تھے۔ غالب کے زمان و مکاں، غالب کے شعور، طرزِ احساس اور

تفکر پر کوئی حد قائم نہیں کرتے۔ منٹو نے غالب پر آدھے درجن کے قریب مضامین لکھے، غالب کے وضع کیے ہوئے مرکبات سے اپنی کئی تحریروں کے عنوانات اخذ کیے (زحمتِ مہر درخشاں، لذتِ سنگ)، غالب کی زندگی پر مبنی ایک فلم کی کہانی لکھی۔ بالواسطہ طور پر غالب کی وسیع المشربی، اخلاقی کشادگی اور اٹل، آزمائے ہوئے نسخوں پر سوالیہ نشان ثبت کرنے کا وہ راستہ اختیار کیا جس سے خود غالب پہچانے جاتے ہیں، اپنے شب چراغ سے اپنی بجھی بجھی سی زندگی کو منور کرنے کا ایک انداز یہ بھی تھا۔ اسی کے ساتھ ساتھ، منٹو نے اُردو فکشن کی اپنی روایت یا بیسویں صدی کے اس محشرستان میں جہاں سماجی وابستگی کے ایک بندھے ٹکے تصور اور ایک سکّہ بند مقصدیت کا بے ہنگم شور برپا تھا، اپنے لیے ایک الگ راہ چُنی اور آپ اپنی پیدا کردہ آزمائش سے گزرنے کا خطرہ مول لیا۔'' (۴)

غالب سے منٹو کی ذہنی قربت کا آغاز، غالباً سنہ ۱۹۴۰ء کے آس پاس، تب ہوا جب انھوں نے غالب پر ''فلمی افسانہ'' لکھنے کا ارادہ کیا۔ صرف ایک ماہ یعنی اکتوبر سنہ ۱۹۴۰ کے پے در پے چار خطوط میں منٹو نے احمد ندیم قاسمی کو بتایا تھا:

پہلا خط:

''میں آج کل ''غالب'' کا مطالعہ کر رہا ہوں اس پر ایک فلمی افسانہ لکھنے کا ارادہ کر رہا ہوں، مواد بہت کم ہے، بہر حال گزارہ ہو جائے گا۔'' (۵)

دوسرا خط:

''...میں آج کل ''غالب'' پر فلمی افسانہ لکھنے کے سلسلے میں بہت مصروف ہوں۔ خدا جانے کیا کیا خرافات پڑھ رہا ہوں۔ سب کتابیں منگوالی ہیں۔ کام کی ایک بھی نہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ ہمارے سوانح نگار، سوانح لکھتے ہیں یا کہ لطیفے۔ بہر حال کچھ نہ کچھ ہو جائے گا۔'' (۶)

تیسرا خط:

''قصہ یہ ہے کہ میں ''غالب'' پر ایک فلمی افسانہ لکھنے والا ہوں۔ کچھ مواد میں نے جمع کرلیا ہے اور کچھ ابھی جمع کرنا ہے۔ مجھے امید ہے کہ افسانہ دلچسپ ہوجائے گا۔ یہ بات اپنے تک ہی رکھیے گا۔'' (۷)

چوتھا خط:

''...غالب کی زندگی کے متعلق میں نے بہت سا مواد جمع کرلیا ہے اور افسانہ لکھنا شروع کردیا ہے۔ دس مناظر لکھ چکا ہوں۔ جب نصف مکمل ہوجائے گا تو آپ کو مسودہ بھیج دوں گا۔ یہ کام مشکل ہے مگر ناممکن نہیں۔'' (۸)

پہلے خط کے جملے ''بہر حال گزارہ ہوجائے گا'' اور دوسرے خط کے جملے ''بہر حال کچھ نہ کچھ ہوجائے گا'' سے اندازہ ہوتا ہے کہ مکتوب نگار کے مطالعۂ غالب نے، اُس کے ذہن میں وہ مرکز ومحور خلق کردیا ہے جس کی بنا پر فلمی افسانے کا تانا بانا بنا جاسکتا ہے۔ تیسرے خط میں درج ہدایت: ''یہ بات اپنے تک ہی رکھیے گا'' بتا رہی ہے کہ غالب پر فلمی افسانے کا خیال، کسی شخص یا فلم ساز ادارے کا دیا ہوا نہیں، منٹو کا طبع زاد تھا۔ چوتھے خط میں مسودے کی ترسیل کا وعدہ، دونوں دوستوں میں جاری باہمی مشورے کی روش کو بھی ظاہر کررہا ہے اور یہ بھی کہ دس مناظر لکھ لینے کے باوجود منٹو کو ''یہ کام مشکل'' محسوس ہو رہا تھا— شاید اسی باعث یہ کام سنہ ۱۹۴۳ کے چوتھے مہینے تک مکمل نہ ہوپایا۔

مذکورہ چار خطوں کے دو سال چار ماہ بعد، یعنی اپریل سنہ ۱۹۴۳ کے خط میں، منٹو نے احمد ندیم قاسمی کو بتایا:

''میں دو کہانیاں لکھ رہا ہوں۔ ایک تو غالب کی سوانح حیات ہے، دوسری ایک ذلیل قسم کی کہانی ہے...'' (۹)

اِس خط کے بعد، منٹو کی کسی تحریر میں غالب پر فلمی افسانہ لکھنے، مکمل کرنے یا کسی فلم ساز کے ہاتھ فروخت کرنے کا ذکر، تاحال تحقیق طلب ہے۔ سنہ ۱۹۵۴ میں فلم ''مرزا غالب'' کی ریلیز پر اُس کے ٹائٹل اور اشتہاروں میں لکھے نام ''ایس۔ ایچ۔ منٹو'' سے عوام وخواص کو

اندازہ ہوا کہ منٹو نے اپریل سنہ ۱۹۴۳ کے بعد، اور جنوری ۱۹۴۸ میں بمبئی چھوڑنے سے قبل، کسی ماہ ''غالب پر فلمی افسانہ'' مکمل کر کے، فلم ساز و ہدایت کار سہراب مودی کے ہاتھ فروخت کیا ہوگا۔

مذکورہ طویل مدّت کے بعد سنہ ۱۹۵۴ میں، اردو کے عام قارئین کو منٹو کی دو کتابوں میں شامل تحریروں سے بھی علم ہوا کہ منٹو نے غالب کے شعر و نثر کے ساتھ طویل وقت گزار کر اُسے حرزِ جاں بنالیا ہے۔

بمبئی چھوڑ کر سات یا آٹھ جنوری سنہ ۱۹۴۸ کو لاہور پہنچنے کے تقریباً تین ماہ بعد، منٹو نے روزنامہ ''امروز'' کے لیے ''ہلکے پھلکے مضامین'' لکھے۔ جن کا مجموعہ ۱۹۵۴ء میں ''تلخ ترش اور شیریں'' کے عنوان سے شائع ہوا۔ مجموعے میں درجِ ذیل تحریریں، بالترتیب، شامل ہیں: غالب اور سرکاری ملازمت۔ آگرہ میں مرزا نوشہ کی زندگی۔ غالب اور چودھویں۔

سنہ ۱۹۵۵ کی ہی مطبوعہ دوسری کتاب ''شکاری عورتیں'' میں ایک تحریر بعنوان ''مرزا غالب کی حشمت خاں کے گھر دعوت'' شامل ہے۔ غالب کے بارے میں منٹو کی پانچویں تحریر ''غالب، چودھویں اور حشمت خاں'' ہے جو کتاب ''منٹو کہانیاں'' میں شائع ہوئی۔ اِس کے ناشر نے لکھا ہے کہ قبل ازیں یہ تحریر منٹو کی کسی کتاب میں شامل نہیں تھی۔

آئندہ سطور میں اِن تحریروں کا مطالعہ، اشاعتی ترتیب کے بجائے غالب کے سوانحی کوائف کے لحاظ سے کیا جائے گا:

✦

''آگرہ میں مرزا نوشہ کی زندگی'' سات چھوٹے بڑے مناظر پر مشتمل ہے۔ اِس میں منٹو نے مرزا کی عمر ''سولہ سترہ کے لگ بھگ'' بتائی ہے اور اُنھیں ہمہ وقت پتنگ بازی یا چوسر میں مگن دکھایا ہے۔ اُن دِنوں وہ مرزا نوشہ کہے جاتے ہیں۔

پہلا منظر ''کشمیرن والے کٹڑے کی ایک چھت'' کا ہے۔ مرزا نوشہ اپنے چھوٹے بھائی مرزا یوسف اور دوست بنسی دھر کے ساتھ پتنگ اڑانے کی تیاری میں ہے۔ کچھ دور دوسری چھت پر کنور بلوان سنگھ اور اُس کا دوست شمشیر سنگھ بھی یہی کچھ کر رہے ہیں۔

منٹو نے یہ منظر لکھتے ہوئے اِس کے پانچوں کرداروں کی زبان سے کئی طرح کی پتنگوں کے نام، ڈور کی قسمیں، پیچوں کی نوعیتیں اور اُس عہد کا محاورہ و روزمرہ ادا کرائے ہیں۔ منظر کے اختتام پر مرزا نوشہ کے مزاج کی ایک جہت واضح کرنے کے لیے منٹو نے دکھایا ہے کہ بلوان سنگھ کے ہاتھوں مرزا کی پتنگ کٹ گئی ہے:

''...اس پر بلوان سنگھ اور اُس کے ساتھی ایک شور برپا کردیتے ہیں: ''وہ کاٹا۔ مرزا نوشہ کٹ گئے۔''

اسداللہ خاں بگڑ جاتا ہے اور سارا نزلہ یوسف اور بنسی دھر پر گرتا ہے: ''بنسی دھر! تمہاری جو بات ہے، بے عقلی سے خالی نہیں۔ گدھے۔ نہیں گدھوں کے سردار ہو۔ تم نے بہت ہی کھردرا مانجھا رکھوایا۔ ورنہ یہ پیچ کٹنے والا نہ تھا۔'' پھر مرزا یوسف پر بگڑنا شروع کیا: ''یوسف! تم نے بھی مجھ پر زور نہ دیا کہ بھائی جان، اس رُخ پر پتنگ نہ بڑھایئے۔''

مرزا یوسف نے آہستہ سے جواب دیا: ''بھائی جان میں نے تو عرض کیا تھا کہ مانجھا بہت کھردرا ہے اور اس پر ڈھیل ہی کے پیچ لڑیں گے۔ اصل میں بلوان سنگھ نے دھوکا دیا۔ پہلے کہا: پیچ پھیٹی دو، پھیٹی پر لڑیں گے اور کھینچ کر پیٹا کاٹ لیا۔''

بنسی دھر نے چرخی تپائی پر رکھی اور کہا: ''چھوٹے مرزا سچ کہہ رہے ہیں۔'' مگر اسداللہ جسے شکست نے جھنجھلا دیا تھا اور بھی بگڑ گیا: ''تم دونوں پتنگ بازی سے ناواقف ہی فقط نہیں بلکہ نرے کھرے بیوقوف ہو۔ اُلو کی دُم فاختہ۔''

بنسی دھر نے غصہ ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی: ''خیر اب جو ہونا تھا ہوگیا۔ آپ نے سیکڑوں پیچ کاٹے ہیں، آج بلوان سنگھ نے دھاندلی کرکے ایک پیچ کاٹ لیا تو کیا ہوا۔''

بہت دیر کے بعد مرزا اسداللہ خاں کا غصہ ٹھنڈا ہوا اور آخر میں یہ طے ہوا کہ چوسر کی ایک بازی رہے...'' (۱۰)

دوسرے منظر میں منٹو نے امراؤ بیگم کو مرزا نوشہ کے طور طریقوں کا شاکی دکھایا ہے۔ وہ اُن کے نانا سے کہتی ہے: ''آپ ہی انھیں سمجھائیں کہ 'اِس طرح قارون کا خزانہ بھی ہو تو خالی ہوجائے'' مرزا کے نانا وعدہ کرتے ہیں کہ ''میں آج ہی کہتا ہوں۔''

تیسرے منظر میں نانا، مرزا کو نصیحتیں کررہے ہیں۔ اسی دوران مرزا کے ایرانی استاد ملّا عبدالصمد پہنچتے ہیں، نانا سے علیک سلیک کرتے ہیں اور اسد اللہ خاں کا ایک اشارہ سمجھ کر، اُسے وہاں سے چلے جانے کو کہتے ہیں۔

چوتھے منظر میں مرزا کے نانا سے ملّا عبدالصمد وہ کچھ کہتے ہیں جو اصلاً منٹو کے قلم سے نوعمر غالب کی زیرِ نمو شاعرانہ صلاحیتوں کو خراجِ تحسین ہے:

''... ملّا صاحب، خواجہ غلام حسین خاں سے مخاطب ہوئے: ''جناب خواجہ صاحب! بُرا نہ مانیے تو ایک بات عرض کروں۔''

خواجہ صاحب نے فوراً ہی کہا: ''نہیں برا ماننے کی کیا بات ہے۔ آپ فرمایئے کیا ارشاد ہے؟''

ملّا صاحب کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ پیدا ہوئی۔ ''مرزا نوشہ، آپ کی طرح کُمیدان یا باپ دادا کی طرح رسال دار یا خان سے بھی زیادہ عہدۂ ہفت ہزاری پر پہنچ کر سپہ سالار بھی ہو گیا تو کیا؟ ایسوں کے نام اُن کے ساتھ ہی مٹ جاتے ہیں مگر اِسے تو ادب اور شعر کا افراسیاب بننا ہے۔''

خواجہ غلام حسین کچھ چکرا سے گئے۔ ''آپ کی اس تقریر سے میں کچھ نہ سمجھا، آپ کا مطلب کیا ہے؟''

ملّا صاحب نے اپنا مطلب واضح کیا: ''اسد اللہ خاں بہت بڑا شاعر ہو گا۔ اس کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا۔ آپ کا اور ہمارا نام اس کی بدولت روشن ہو گا۔ سو اس کو اپنے حال پر چھوڑ دیجیے۔''

خواجہ صاحب نے ملّا عبدالصمد کے کاندھے پر ہاتھ رکھا اور کہا: ''ملّا صاحب! میں تو حباب برآب ہوں اور آپ اپنے وطن ایران جارہے ہیں۔ باقی اگر آپ کا یہی خیال ہے کہ مرزا نوشہ فنِ شاعری میں نام پیدا کرے گا اور اس کا کلام قیامت تک باقی رہے گا تو یوں ہی سہی۔ خدا ایسا ہی کرے۔ آپ کے مُنہ میں گھی اور شکّر۔''

دونوں باتیں کرتے ہوئے دیوان خانے میں چلے گئے...'' (۱۱)

پانچویں منظر میں مرزا نوشہ اور بنسی دھر چوسر کھیل رہے ہیں۔ مرزا یوسف بھی ساتھ ہیں۔ زبانوں پر اس کھیل کی اصطلاحیں رواں ہیں۔ اسی دوران... ''خواجہ غلام حسین صاحب کا ملازم گھبرایا ہوا کمرے میں داخل ہوا اور اطلاع دی: ''حضور! آپ کے نانا جان کی بری حالت ہے، دل پکڑے کراہ رہے ہیں۔'' (۱۲) بازی کو یوں ہی بچھا چھوڑ کر اسداللہ خاں، ملازم کے ساتھ چلا گیا۔

چھٹے منظر میں منٹو نے دکھایا ہے کہ اسداللہ گھر پہنچا، وہاں کہرام برپا تھا۔ ''خواجہ غلام حسین بعارضۂ دل انتقال کر چکے تھے۔'' (۱۳)

ساتویں منظر کی تمہید میں منٹو نے لکھا ہے: ''...نانا کے انتقال کے بعد اسداللہ خاں کی لااُبالی طبیعت اور زیادہ رنگ لائی۔ امراؤ بیگم کی شکایتیں بڑھتی گئیں۔'' (۱۴)

اِس تمہید کے بعد، منظر میں نواب احمد بخش اور اُن کے چھوٹے بھائی: نواب الٰہی بخش معروفؔ، محوِ گفتگو ہیں۔ یہ گفتگو گویا دہلی میں معروفؔ کے مکان پر ہو رہی ہے:

''نواب احمد بخش! مرزا نوشہ نے اپنے نانا کے مرتے ہی خوب گُل چھرّے اُڑانے شروع کیے ہیں۔ میرے خیال میں اگر اُن کا یہی عالم رہا تو جائیداد وغیرہ سب کنارے لگ جائے گی۔ بھتیجی اور بیٹی میں کیا فرق ہے جیسے امراؤ بیگم تمہاری بیٹی ویسی میری۔''

نواب الٰہی بخش نے باادب پوچھا: ''تو پھر بھائی جان کیا کیا جائے؟''

نواب احمد بخش نے رائے دی: ''یہ کیا جائے کہ تم مرزا نوشہ کو اپنے پاس بلا لو اور اپنی نگرانی میں رکھو۔'' اور پھر تاکیداً کہا: ''دیر نہ کرو — جلد جاؤ اور اُس کو لے آؤ کہ اِسی میں خیریت ہے، ڈیڑھ ہزار روپیہ سالانہ جو اُس کو اور مرزا یوسف کو ملتا ہے وہ بھی چٹ کر جاتا ہے۔ اور میں سنتا ہوں، ماں سے الگ لیتا ہے اور نانا کی جائیداد املاک پر بھی ہاتھ صاف کر رہا ہے، یا کر چکا ہے۔ تم اُس سے کہہ دینا کہ بھائی جان نواب احمد بخش صاحب کی بھی یہی رائے ہے کہ تم دلّی چلے آؤ۔''

دونوں بھائیوں کے فیصلے کے مطابق مرزا اسداللہ خاں کو آخر آگرہ چھوڑ کر دلی جانا پڑا۔ جہاں اپنے خسر نواب الٰہی بخش خاں معروف کی نگرانی میں اُس کی زندگی کا دوسرا دور شروع ہوا۔''(۱۵)

آگرے میں غالب کے لڑکپن کا یہ احوال، فلم ''مرزا غالب'' میں شامل نہیں ہے۔ نہیں کہا جاسکتا کہ کہانی و منظرنامہ کی آخری شکل میں منٹو نے یہ احوال برقرار رکھا تھا یا نہیں — یعنی اس کی عدم شمولیت کا فیصلہ منٹو نے کیا تھا یا سہراب مودی وغیرہ نے۔ کتاب ''تلخ ترش اور شیریں'' میں شامل اِس تحریر پر غور کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اِن مناظر میں منٹو نے مرزا نوشہ کی بے فکریوں کا اثر امراؤ بیگم پر دکھایا ہے۔ دوسرے منظر میں خواجہ غلام حسین خاں سے مرزا نوشہ کی شکایت، بہ زبانِ امراؤ، بہ تفصیل دکھائی — اور جب خواجہ اِس دنیا میں نہ رہے تو، آخری منظر میں، نواب احمد بخش کا اوّلین مکالمہ امراؤ بیگم کے حوالے سے لکھا — مزید یہ کہ مکالمے سے قبل یہ وضاحت تحریر کی کہ ''امراؤ بیگم کی شکایتیں بڑھتی گئیں۔''

اِن مناظر کی عدم شمولیت کا فیصلہ کسی نے بھی کیا ہو، مناسب ہی رہا، کیونکہ فلم کے لیے مقررہ دائرۂ خیال میں اِن مناظر کی معنویت کچھ بھی نہیں۔ فلم کا دائرہ ''مرزا غالب'' پر ہے ''مرزا نوشہ'' پر نہیں۔

✦

''تلخ ترش اور شیریں'' میں غالب سے متعلق منٹو کی دوسری تحریر ''غالب اور سرکاری ملازمت'' کے زیرِ عنوان شامل ہے۔ مناظر میں تقسیم کر کے دیکھا جائے تو یہ چار مناظر پر مشتمل ہے:

پہلے منظر سے قبل، کچھ تمہیدی جملے ہیں جو لب و لہجے میں ریڈیو کمنٹری اور فلمی منظر کی عقبی وضاحت سے مطابقت رکھتے ہیں:

''حکیم محمود خاں مرحوم کے دیوان خانے کے متصل یہ جو مسجد کے عقب میں ایک مکان ہے، مرزا غالب کا ہے۔ اسی کی نسبت آپ نے ایک دفعہ کہا تھا:۔

مسجد کے زیر سایہ اک گھر بنا لیا ہے
یہ بندۂ کمینہ ہمسایۂ خدا ہے

آیئے ہم آپ کو دیوان خانے میں لے چلیں۔ کوئی حرج نہیں، رات ہے تو کیا، مرزا صاحب کے یہاں یقیناً اس وقت بھی رونق ہوگی۔ رونق تو خیر اتنی نہیں لیکن منشی شیونرائن موجود ہیں۔" (۱۶)

پہلا منظر منشی شیونرائن اور غالب کی گفتگو پر قائم ہے۔ موضوعِ گفتگو، میر امانی اسد کی وہ غزل اور مقطع ہے جس کے باعث غالب نے، اسد تخلص تقریباً ترک کر دیا تھا۔ منٹو نے اس گفتگو میں، غالب کی زبان سے وہ جملے، خفیف تبدیلیوں کے ساتھ، ادا کرائے ہیں جو انھوں نے منشی شیونرائن آرام کے نام خط، مورخہ ۲۶ر اپریل ۱۸۵۹ء، میں تحریر کیے تھے ــــ اور غالباً، اسی بنا پر منٹو نے شیونرائن کو اِس منظر میں غالب کا مخاطب کردار بنایا ہے:

"منشی شیونرائن: (مرزا صاحب سے کاغذ لیتے ہوئے) تو کیا سچ مچ یہ غزل آپ کی نہیں؟

غالب: (بھنا کر) بھائی حاشا ثُمّ حاشا اگر یہ غزل میری ہو۔ اسد اور لینے کے دینے پڑے ہیں۔ لاحول ولا۔ اس غریب کو میں کچھ کیوں کہوں۔ لیکن اگر یہ غزل میری ہو تو مجھ پر ہزار لعنت۔ اِس سے آگے ایک شخص نے یہ مطلع میرے سامنے پڑھا اور کہا۔ قبلہ آپ نے کیا خوب کہا ہے:

اسد اس جفا پر بتوں سے وفا کی
مرے شیر شاباش رحمت خدا کی

میں نے اُس سے کہا: اگر یہ مطلع میرا ہو تو مجھ پر لعنت۔ بات یہ ہے کہ ایک شخص میر امانی اسد ہو گزرے ہیں اور یہ غزل اُن ہی کے شان دار کلام کا نمونہ ہے۔ منشی شیونرائن! تم طرزِ تحریر پر بھی غور نہیں کرتے۔

منشی شیونرائن: (کاغذ تہہ کر کے جیب میں رکھتے ہوئے) مجھے افسوس ہے۔" (۱۷)

محسوس کیا جا سکتا ہے کہ مرکزی موضوع سے قبل یہ مختصر سا منظر، منٹو نے اپنے قاری کو غالب کے معیارِ سخن اور طریقۂ طنز و تعریض سے آگاہ کرنے کے لیے لکھا ہے۔

منظر کے اگلے جزو میں غالب کو خبر ملتی ہے کہ مسٹر ٹامسن اُنھیں، کالج میں فارسی کا استاد مقرر کرنا چاہتے ہیں۔ اس لیے کل دس بجے اُنھیں کوٹھی پر بلایا ہے۔ اِس خبر پر، منشی شیو نرائن، غالب کو مبارک باد دینا چاہتے ہیں مگر — اختتامِ منظر پر:

''غالب: (مسکرا کر اُٹھتے ہوئے) نہیں — سب سے پہلے مجھے اپنی بیگم کی مبارک باد لینے دو۔ (۱۸)

دوسرے منظر کی ابتدا میں منٹو نے لکھا ہے:

''مرزا غالب زنان خانے میں خوش خوش داخل ہوتے ہیں۔ کیا دیکھتے ہیں کہ امراؤ بیگم بیٹھی وضو کر رہی ہیں۔ انہیں دیکھتے ہی انہوں نے مُنہ سُجا لیا اور کہنا شروع کیا:

امراؤ بیگم: آج دو روز سے کہہ رہی ہوں کہ ایک وقت میرے پاس بیٹھ کر ٹھنڈے دل سے میری چند باتیں سن لیجیے۔ پر آپ کو فرصت کہاں!

غالب: (پاس ہی چوکی پر بیٹھ کر) بیگم صاحبہ! مجھے معلوم ہے کہ آپ مہین مہین چٹکیاں لے کر نصیحتیں یا فضیحتیں کیجیے گا۔ خیر فرمائیے۔

امراؤ بیگم: (چڑ کر) دیکھیے پھر آپ نے طعن طروز کی باتیں شروع کر دیں۔

غالب: (زیرِ لب مسکراتے ہوئے) اچھا جو آپ کہنا چاہتی ہیں کہیے۔

امراؤ بیگم: میں کہتی ہوں کہ کب تک گھر کا اثاثہ بیچ کر گزران ہوگی۔ کس طرح یہ بیل منڈھے چڑھے گی؟ قرض کس صورت سے ادا ہوگا؟ اے قرض جائے جہنم میں۔ روزمرہ کے مصارف کس طرح پورے ہوں گے۔ اب تو لتے بدن پر جھولنے کا زمانہ آ گیا ہے۔

غالب: (پراسرار طریقے پر مسکراتے ہوئے) آپ گھبرائیے مت۔ خدا نے سن لی ہے۔ (چوکی پر سے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں)

امراؤ بیگم: کیا سن لی ہے خدا نے؟

غالب: (فاتحانہ انداز میں) آپ کے وظیفوں کی برکت سے، مسٹر ٹامسن بہادر نے

مجھے بلایا ہے۔ کالج میں فارسی زبان کا استاد مقرر کرنا چاہا ہے اور یقینی طور پر میری ہی اک ایسی ذات ہے جو اس عہدے کے لائق ہے۔

امراؤ بیگم: اپنے مُنہ میاں مٹھو!

غالب: اجی سن تو لیجیے۔ کم سے کم... کم سے کم۔ کچھ نہیں تو سو ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار تو میرا مقرر ہو ہی جائے گا۔ لیجیے اب خوش ہوئیں۔

امراؤ بیگم: (لوٹا لے کر اُٹھتے ہوئے) ہو گئی۔

غالب: تو ذرا ہنس دیجیے۔

امراؤ بیگم: چو چلے نہ بگھاریے۔

غالب: (خوش طبعی سے) نہیں، میری جان کی قسم ہنسو، تاکہ ذرا مجھے تمہاری طرف سے اطمینان ہو۔

امراؤ بیگم: (کھِل کھلا کر ہنس پڑتی ہے)

غالب: (اطمینان کے ساتھ) خدا میری بیگم کو ہنستا ہی رکھے۔ بھئی امراؤ بیگم! تم غالب کی روح و رواں ہو۔

امراؤ بیگم: اب اپنی شاعری رہنے دیجیے اور صاحب سکتر بہادر کے ہاں جانے کی تیاری کیجیے۔ (۱۹)

پہلے منظر کے اختتامی فریم میں غالب کی مسکراہٹ کو ذہن میں رکھتے ہوئے، اس منظر پر غور کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ منٹو نے امراؤ بیگم کے ٹھیٹ گھریلو پن کو نمایاں کرنے کے لیے تحریر کیا تھا۔ سوانحِ غالب میں امراؤ بیگم کے مزاج، طور طریقوں اور طرزِ گفتگو کی تقریباً عدم موجودگی کو دیکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ — مرزا کے نانا سے اُن کی شکایت کے بعد — اِس منظر میں، منٹو کے تخیل نے امراؤ بیگم کی شخصیت کا ایک اہم پہلو نقش کر دیا ہے۔ علاوہ ازیں، غالب کے چُہل بھرے طرزِ گفتار کی مدد سے قاری کو محسوس کرایا ہے کہ اِس قماش کا شخص، کس کس طور ناگواریوں کو گوارا بنا لیتا ہے۔

تیسرا منظر، مسٹر ٹامسن سے ملاقات کے لیے غالب کی تیاری سے شروع ہوتا ہے۔ درباری کپڑے پہن کر غالب، ہوادار میں سوار ہوئے اور مسٹر ٹامسن کی کوٹھی پر پہنچے مگر ''دستور کے موافق'' پذیرائی نہ پاکر ''خدمت سے معافی'' چاہی۔ سوانحِ غالب میں شامل اِس معروف واقعے کے بعد، منٹو کے تخیّل نے اِس تحریر کا چوتھا اور آخری منظر ترتیب دیا ہے:

> غالب ہوادار میں بیٹھ جاتے ہیں اور کہاروں کو حکم دیتے ہیں کہ واپس گھر چلو۔ واپس آئے تو کیا دیکھتے ہیں: گھر کے باہر اپاہجوں اور بھکاریوں کا ہجوم جمع ہے اور بی رحیمن اُن میں خیرات بانٹ رہی ہے۔ مرزا صاحب کو سخت حیرت ہوئی۔ جلدی جلدی اندر داخل ہوئے۔ صحن میں پہنچے تو دیکھا کہ تخت پر امراؤ بیگم دوگانہ ادا کرنے میں مشغول ہیں۔ انہوں نے سلام پھیرتے ہی مرزا صاحب کو مخاطب کیا:

امراؤ بیگم: الحمدللہ۔ کہیے خدا کا فضل ہوگیا؟

غالب: (غالب تخت پر بیٹھتے ہوئے) جی ہاں۔ ہوگیا۔

امراؤ بیگم: کیا مطلب؟

غالب: مطلب یہ کہ رہی سہی عزت، مٹی میں ملنے سے بچ گئی۔

امراؤ بیگم: ہائیں۔ یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟

غالب: (اُٹھ کر، تمکنت کے ساتھ) بیگم عزت و ناموس کے لیے ہم مغل بچے مر مٹنے والے ہیں۔ میں وہاں اس خیال سے گیا تھا کہ ملازمتِ سرکاری سے کچھ اس عزت میں اضافہ ہوجائے گا۔ مگر وہاں صاحب سکتر بہادر میرے استقبال کو باہر نہ آئے۔ بھلا سوچو۔ مجھے یہ بے عزتی کیسے گوارا ہوسکتی ہے؟

بندگی میں بھی وہ آزادۂ وخود بیں ہیں کہ ہم
الٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا
لیکن میں پوچھتا ہوں۔ یہ باہر خیرات کیسی بٹ رہی ہے؟

امراؤ بیگم: (فکر مند ہو کر) کچھ نہیں۔

غالب: کچھ نہیں کیا؟ تم تو ابھی کل ہی کہہ رہی تھیں: کب تک گھر کا اثاثہ بیچ کر گزران ہوگی۔

امراؤ بیگم: (مسکرا دیتی ہیں)

غالب: ارے بھئی کچھ بتاؤ تو؟

امراؤ بیگم: کیا بتاؤں؟ — کل میں نے اپنا جڑاؤ گلو بند بی رحیمن سے گرو رکھوا کر کچھ روپے منگوائے تھے۔ شہر میں آپ کی ملازمت کا چرچا سن کر، در پر یہ بھکاری جمع ہو گئے تو میں نے بی رحیمن سے کہا: جاؤ اُن کا سر صدقہ دے آؤ۔

غالب کھلکھلا کر ہنس پڑتے ہیں — امراؤ بیگم گہری سوچ میں پڑ جاتی ہیں۔" (۲۰)

اس منظر میں امراؤ بیگم کے آخری مکالمے سے قبل، اُن کی مسکراہٹ، منٹو کی خلق کردہ ہے جس میں وہ اپنے عمل کو غالب سے چھپا رہی ہیں مگر پھر غالب کے اصرار پر بیان بھی کرتی ہیں۔ اُن کے لبوں پر یہ مسکراہٹ، منٹو کا لگایا زخمہ ہے جس نے اُن کے بے شمار گھاؤ قاری کے حواس تک پہنچا دیے ہیں۔ مزید برآں، امراؤ کے آخری مکالمے کے بعد، غالب کا کھلکھلا کر ہنسنا — منٹو کے پُر بلاغت قلم کا ایسا کمال ہے کہ جس کی وضاحت لفظوں سے ممکن نہیں — مگر اونے پونے کہا جا سکتا ہے کہ اِس مسکراہٹ میں منٹو نے غالب کی وہ لا انتہا بے بسی، حبہ حبہ سمودی ہے جو اپنے معاشرے سے تصادم میں وہ بہ باطن محسوس کرتے رہے — اور وہ کچھ اختیار بھی اِس کھلکھلاہٹ کا حصہ ہیں جو غالب جیسوں کو اندر اندر اپنے معاشرے اور خود پر ہنسنے کے لیے ہمیشہ حاصل رہے — ایک اور اونی پونی وضاحت: غالب کی کھلکھلاہٹ قاری تک پہنچانے کے لیے یہ تحریر خلق کرنے والے منٹو کو بھی کچھ ایسی ہی پُر قوت بے بسی اور اندر اندرر کے اختیار حاصل رہے — یہاں غالب کو یہ کھلکھلاہٹ اُسی باعث نصیب ہوئی۔

✦

''تلخ ترش اور شیریں'' میں شامل تیسری تحریر کا عنوان ہے: غالب اور چودھویں۔ سابقہ دو تحریروں کی طرح، یہ بھی منظرنامے کی تکنیک میں ہے۔ اس کے بیشتر اجزا، فلم مرزا غالب کے لگ بھگ مساوی ہیں لہٰذا اُن کے مفصّل ذکر کے بجائے یہاں صرف اُن اجزا و نکات کا ذکر مناسب ہوگا جو منٹو نے اپنے ممدوح کے ذہن و دل کی جہات قاری پر کھولنے کے لیے خلق کیے ہیں۔

تحریر کی ابتدا درجِ ذیل سرنامے سے ہوئی ہے:

''مرزا غالب اپنے دوست حاتم علی مہر کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

''مغل بچے بھی عجیب ہوتے ہیں کہ جس سے عشق کرتے ہیں اس کو مار رکھتے ہیں۔ میں نے بھی اپنی جوانی میں ایک بڑی ستم پیشہ ڈومنی سے عشق کیا ہے اور اسے مار رکھا ہے۔''

سنہ ۱۲۶۴ھ میں مرزا غالب چوسر کی بدولت قید ہوئے۔ اس واقعے کے متعلق ایک فارسی خط میں لکھتے ہیں۔

''کوتوال دشمن تھا اور مجسٹریٹ ناواقف۔ فتنہ گھات میں تھا اور ستارہ گردش میں۔ باوجودیکہ مجسٹریٹ کوتوال کا حاکم ہے، میرے باب میں وہ کوتوال کا محکوم بن گیا اور میری قید کا حکم صادر کردیا۔''

افسانہ نگار کے لیے یہ چند اشارے مرزا غالب کی رومانی زندگی کا نقشہ تیار کرنے میں کافی مدد دے سکتے ہیں۔ رومان کی ازلی تکون تو ''ستم پیشہ ڈومنی'' اور ''کوتوال دشمن تھا'' کے مختصر الفاظ مکمل کردیتے ہیں۔

ستم پیشہ ڈومنی سے مرزا غالب کی ملاقات کیسے ہوئی؟
آیئے ہم تخیل کی مدد سے اُس کی تصویر بناتے ہیں۔" (۲۱)

اِن سطور میں منٹو نے وہ نکتہ کھول دیا ہے جو اُسے غالب کی سوانح، اُن کے خطوط اور اُن کی شاعری کے مطالعے پر غور و فکر سے حاصل ہوا تھا۔

ستم پیشہ ڈومنی سے غالب کی ملاقات کی تخیلی تصویر کا پس منظر تیار کرتے ہوئے، منٹو نے لکھا ہے:

"صبح کا وقت ہے۔ مُرغ اذانیں دے رہے ہیں۔ مرزا نوشہ ہوادار میں بیٹھا ہے۔ جسے چار کہار لیے جا رہے ہیں۔ مرزا نوشہ کی نشست سے پتہ چلتا ہے کہ سخت افسردہ ہے۔ افسردگی کا باعث یہ ہے کہ اُس نے مشاعرے میں اپنی بہترین غزل سنائی مگر حاضرین نے داد نہ دی۔ ایک فقط نواب شیفتہ نے اُس کے کلام کو سراہا، صدرالدین آزردہ نے اس کی حوصلہ افزائی کی لیکن بھرے ہوئے مشاعرے میں دو آدمیوں کی داد سے کیا ہوتا ہے۔ مرزا نوشہ کی طبیعت اور بھی زیادہ مکدر ہوئی تھی جب لوگوں نے ذوق کے کلام کو صرف اس لیے پسند کیا کیونکہ وہ استادِ شاہ تھا۔

مشاعرہ جاری تھا مگر مرزا نوشہ اُٹھ کر چلا آیا۔ وہ اور زیادہ کوفت نہیں اٹھا سکتا تھا۔ مشاعرے سے باہر نکل کر وہ ہوادار میں بیٹھا۔ کہاروں نے پوچھا: "حضور، کیا گھر چلیں گے؟"

مرزا نوشہ نے کہا: "نہیں۔ ہم ابھی کچھ دیر سیر کریں گے — ایسے بازاروں سے لے چلو جو سنسان پڑے ہوں۔"

کہار بہت دیر تک مرزا نوشہ کو اٹھائے پھرتے رہے۔ جس بازار سے بھی گزرے وہ سنسان تھا۔ چودھویں کا چاند غروب ہونے کے لیے نیچے جھک گیا تھا۔ اُس کی روشنی اداس ہوگئی تھی۔

ایک بہت ہی سنسان بازار سے ہوادار گزر رہا تھا کہ دور سے سارنگی کی آواز آئی۔ بھیرویں کے سُر تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد کسی عورت کے گانے کی تھکی ہوئی آواز آئی۔ مرزا نوشہ چونک پڑا۔ اُس کی غزل کا ایک مطلع بھیرویں کے سُروں پر تیر رہا تھا:

نکتہ چیں ہے غمِ دل اُس کو سنائے نہ بنے

کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے

آواز میں درد تھا، جوانی تھی لیکن یہ مطلع ختم ہوتے ہی آواز ڈوب گئی۔'' (۲۲)

اِس عبارت میں مرزا کی سخت افسردگی، افسردگی کی وجوہ اور وجوہ کا ردِ عمل بیان کرنے کے بعد، منٹو نے، اُن ہی کی ایک غزل کا مطلع، اُن کے گوش گذار کیا ہے۔ مطلع کی معنویت میں دور تک جانے پر محسوس کیا جاسکتا ہے کہ اس کے ذریعے منٹو نے، غالب کی اُس تخلیقی تنہائی کو قاری کی فہم کا جزو بنانے کی کوشش کی ہے جس سے اُن کا سابقہ صرف آج کی بات نہیں؛ یہ گھاؤ تو اُن کے ساتھ تب سے ہے جب اُن کے تخلیقی شعور نے آنکھ کھولی تھی۔ اس گھاؤ کو آج مشاعرے کے سخن ناشناسوں نے کُھرچا ہے تو وہ گویا شہر بھر کے سناٹوں کو اپنی ٹیس کا گواہ بنا رہے ہیں۔ اُن کے باطن کی ہُوک کو دُہرانے والی آواز کا لہرا غالب کو اُس در پہ کھینچ لے گیا جہاں اِک شوخ چشم سانولی سلونی اُن کی تازہ غزل کی منتظر ہے۔

چودھویں کے دل ودماغ پر غالب کی سخن طرازی کا نقش اور غالب کے دل ودماغ پر چودھویں کی سخن فہمی کا نقش ثبت کر کے، منٹو نے اپنی فلم میں، چودھویں کو غالب کی تخلیقی اور معاشرتی تنہائی کا وہ مداوا بنا دیا ہے جس کی آرزو غالب جیسے تخلیقی ذہنوں کو ہمیشہ رہی —— خود منٹو کو بھی تھی —— اُس نے تنہائیوں اور زحمتوں کی گھڑیوں میں بارہا، اپنے ہم نفس غالب کا کلام ایک مداوے، ایک ڈھارس کی طرح برتا ہے۔ منٹو کی کتابوں پر سرسری نظر سے ہی اندازہ ہو جاتا ہے کہ وہ مختلف النوع تحریروں میں کلامِ غالب سے روشنی حاصل کرتے رہے —— مٹھی بھر مثالیں:

سنہ ۱۹۴۲ء میں مطبوعہ کتاب ''منٹو کے مضامین'' میں دو ابتدائی تحریروں کے عنوان، اشعارِ غالب سے ماخوذ ہیں: ''چھیڑ خوباں سے چلی جائے اسد'' اور '' کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی۔'' مزید برآں، ہر دو تحریروں کا آغاز، منٹو نے اِس ڈھنگ سے کیا ہے کہ شعر کا ایک مصرع بطورِ عنوان ثبت کرنے کے بعد مصرعۂ دیگر کو آغازِ مضمون کا ذریعہ بنایا ہے:

عنوان ہے: چھیڑ خوباں سے چلی جائے اسدؔ

مضمون کا آغاز:

گر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی۔ سو جب تک مردوں کو وصل نصیب نہیں ہوتا، وہ حسرت ہی سے دل بہلاتے رہیں گے اور خوباں سے چھیڑ چھاڑ کا سلسلہ جاری رہے گا... (۲۳)

کتاب کے دوسرے مضمون کا عنوان ہے: کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی۔

آغازِ مضمون:

قطع کیجیے نہ تعلق ہم سے ـــ کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی ـــ قطعِ تعلق بھی ہے اور نہیں بھی ہے۔ عجیب و غریب مضمون ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ مرد اور عورت کا باہمی رشتہ کیا ہے۔ عورت کی طرف مرد کا میلان سمجھ میں آجاتا ہے لیکن مرد کی طرف عورت کا میلان، جو ہے بھی اور نہیں بھی ہے، سمجھ سے اونچا ہی رہتا ہے یعنی عورت مرد سے نفرت بھی کرتی ہے اور انجامِ کار اُس سے محبت بھی کرتی ہے۔ اُس کی بدعنوانیوں کی مذمت کرتی ہے مگر اس کے باوجود اُن بدعنوانیوں کا شکار ہو جاتی ہے۔'' (۲۴)

✦

منٹو نے اپنے ایک افسانے ''آرٹسٹ لوگ'' کا اوّلین جزو، غالب کے ایک شعر میں مذکور، محبوب کی جفا اور پشیمانی کے پیشِ نظر تحریر کیا ہے جو تقریباً دو صفحات پر مشتمل ہے:

''جمیلہ کو پہلی بار محمود نے باغِ جناح میں دیکھا۔ وہ اپنی دو سہیلیوں کے ساتھ چہل قدمی کر رہی تھی... وہ جمیلہ کے حسن سے بہت متاثر ہوا۔

...محمود اُس کے پیچھے چلنے لگا۔

ایک جگہ اس نے جرأت سے کام لے کر جمیلہ سے کہا: ''حضور اپنا نقاب تو سنبھالیے — ہوا میں اُڑ رہا ہے۔''

جمیلہ نے یہ سن کر شور مچانا شروع کردیا۔ اس پر پولیس کے دو سپاہی دوڑتے آئے۔

جمیلہ نے اُن سے کہا: ''یہ لڑکا مجھ سے چھیڑ خانی کر رہا تھا — جب سے میں اِس باغ میں داخل ہوئی ہوں، یہ میرا پیچھا کر رہا ہے۔''

سپاہیوں نے محمود کو گرفتار کرلیا۔ مقدمہ چلا محمود کا جرم ثابت ہوگیا اور اسے دو ماہ قید بامشقت کی سزا مل گئی۔

جیل خانے میں وہ کئی مرتبہ بچّوں کی طرح رویا — اس کو مصوّری کا شوق تھا لیکن اس سے وہاں چکّی پسوائی جاتی تھی۔

ابھی اسے جیل خانے میں آئے بیس روز ہی ہوئے تھے کہ اسے بتایا گیا کہ اس کی ملاقات آئی ہے — محمود نے سوچا کہ یہ ملاقاتی کون ہے؟

سپاہی اسے دروازے کے پاس لے گیا جو آہنی سلاخوں کا بنا ہوا تھا۔ ان سلاخوں کے پیچھے اُس نے دیکھا کہ جمیلہ کھڑی ہے — وہ بہت حیرت زدہ ہوا — اس نے سمجھا کہ شاید کسی اور کو دیکھنے آئی ہوگی۔ مگر جمیلہ نے سلاخوں کے پاس آکر اس سے کہا: ''میں آپ سے ملنے آئی ہوں۔'' محمود کی حیرت میں اور بھی اضافہ ہوگیا۔ ''مجھ سے —؟''

''جی ہاں — میں معافی مانگنے آئی ہوں کہ میں نے بہت جلد بازی کی۔ جس کی وجہ سے آپ کو یہاں آنا پڑا۔''

محمود مسکرایا۔ ''ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا۔''

جمیلہ نے کہا: ''یہ غالب ہے؟''

''جی ہاں۔ غالب کے سوا اور کون ہوسکتا ہے جو انسان کے جذبات کی...... [ایسی؟] ترجمانی کرسکے — میں نے آپ کو معاف کردیا — لیکن میں یہاں آپ کی کوئی خدمت نہیں کرسکتا...''

جمیلہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ''میں آپ کی خادمہ ہوں۔''

چند منٹ ان کے درمیان اور باتیں ہوئیں جو محبت کے عہد و پیمان تھیں۔ اس کے بعد جمیلہ ہر پندرھویں دن محمود سے ملاقات کے لیے آتی رہی۔

جمیلہ نے محمود کو ایک روز بتایا: ''مجھے موسیقی سیکھنے کا شوق ہے — آج کل میں خاں صاحب سلام علی خاں سے سبق لے رہی ہوں۔'' (الخ) (۲۵)

محمود کی زبان سے شعرِ غالب: ''کی مرے قتل کے بعد اُس نے جفا سے توبہ؛ ہائے اُس زود پشیماں کا پشیماں ہونا'' کا مصرعۂ ثانی اور جمیلہ کے درست اندازے پر مبنی سوال: ''یہ غالبؔ ہے؟'' کے ذریعے، منٹو اپنے قاری کو محسوس کرانا چاہتا ہے کہ کلامِ غالب صرف شعر و ادب والوں کی دنیا میں زباں زد نہیں، وہ دیگر فنونِ لطیفہ سے تعلق رکھنے والوں کی بھی قوّتِ اظہار ہے، سخن شناسوں کو غالب کا مصرع بھر کلام ہی اُس کے طرزِ فکر و بیان کی پہچان کے لیے بہت ہے اور گفتۂ غالب، انسانی جذبات میں عفو و درگزر کی قوّتیں بھی بیدار کرتا ہے — (''بخش دو گر خطا کرے کوئی'')

✦

سنہ ۱۹۵۴ء میں مطبوعہ منٹو کی کتاب ''اوپر نیچے اور درمیان'' اٹھائیس غیر افسانوی تحریروں پر مشتمل ہے۔ تقریباً ہر تحریر کا ظاہری رنگ مزاح ہے جبکہ بیشتر کا بین السطور: گہرا طنزیہ اور الم خیز۔ اسی کتاب میں چچا سام کے نام منٹو کے وہ نو خط بھی شامل ہیں جو مصنّف کی گہری سیاسی بصیرت، ہجوِ ملیح اور طنز کا نمونہ ہیں۔ ''چچا سام کے نام ایک خط'' میں منٹو نے زیرِ قلم موضوع سے ذرا ہٹ کر، دو مختصر پارے تحریر کیے ہیں جو اُن کی غالب فہمی اور غالب سے عقیدت کا اظہار ہیں:

''ہماری زبان اردو کا ایک شاعر غالب ہوا ہے اس نے آج سے قریب قریب ایک صدی پہلے کہا تھا:

ہوئے مر کے ہم جو رسوا ہوئے کیوں نہ غرقِ دریا
نہ کبھی جنازہ اٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا

غریب کو زندگی میں اپنی رسوائی کا ڈر نہیں تھا، کیونکہ وہ اوّل تا آخر رسوائے زمانہ رہا۔ اس کو خوف اس بات کا تھا کہ بعداز مرگ رسوائی ہوگی، آدمی وضع دار تھا۔ خوف نہیں بلکہ یقین تھا اسی لیے اس نے غرقِ دریا ہونے کی خواہش کی کہ نہ جنازہ اٹھے نہ مزار بنے۔

کاش وہ آپ کے ملک میں پیدا ہوا ہوتا۔ آپ اس کا بڑی شان وشوکت سے جنازہ اٹھاتے اور اس کا مزار اسکائی اسکریپر کی صورت بناتے اور اگر اسی کی خواہش پر عمل کرتے تو شیشے کا ایک حوض تیار کرتے جس میں اس کی لاش رہتی دنیا تک غرق رہتی اور چڑیا گھر[؟ عجائب گھر] میں لوگ اسے جاجا کر دیکھتے۔'' (۲۶)

✦

ایک تحریر بعنوان ''بن بلائے مہمان'' کی ابتدا منٹو نے اِن سطور سے کی ہے:

''غالب کہتا ہے:

میں بلاتا ہوں اُن کو مگر اے جذبۂ دل
اُن پہ بن جائے کچھ ایسی کہ بن آئے نہ بنے

یعنی اگر اُسے بن بلائے مہمانوں سے کد ہوتی تو یہ شعر ہمیں اُس کے دیوان میں ہرگز نہ ملتا۔

غالب کہتا ہے میں بلاتا تو ہوں اُن کو۔ مگر میرا جی تو یہ چاہتا ہے کہ کوئی ایسی بات ہو جائے کہ وہ بن بلائے چلے آئیں اور سچ تو یہ ہے کہ بلا کر کسی کے آجانے میں وہ مزا کہاں ہے جو بن بلائے آجانے میں ہے لیکن سمجھ میں نہیں آتا، کیوں لوگوں کو بن بلائے مہمانوں سے خدا واسطے کا بیر ہے۔'' (۲۷)

محولہ سطور سے صاف ظاہر ہے کہ منٹو نے شعرِ غالب کو اپنے ذہن میں پیدا شدہ خیال کا تابع بنالیا ہے۔ اِس کا اعتراف، مضمون کے اگلے ہی پارے میں، منٹو نے یہ لکھ کر کیا ہے:

''آپ کہیں گے کہ صاحب غالب نے تو معشوقوں کے متعلق کہا تھا کہ اُن کا بن بلائے آ جانا عاشقوں کے لیے ایک بہت ہی بڑی بات ہے۔ آپ نے زبردستی یہ شعر مہمانوں کے ساتھ چپک دیا۔ اچھا صاحب یوں ہی سہی، لیکن نفسیات کی روشنی تو موجود ہے۔ چلیے اُسی میں بن بلائے مہمانوں کو دیکھ لیتے ہیں۔'' (۲۸)

یعنی منٹو کی اصل غرض، بن بلائے مہمانوں اور ان کے میزبانوں کو انسانی نفسیات کی روشنی میں دیکھنا اور سمجھنا تھا — مگر کیونکہ مضمون کے زمانۂ تحریر تک غالب کی شاعری اُن کی ذہنی متاع بن چکی تھی لہٰذا شعرِ غالب پر اپنے مال جیسا اختیار برت کر، اظہارِ مدّعا کا ذریعہ بنالیا۔

✦

''چچا سام کے نام تیسرا خط'' میں غالب کے ایک مصرع کو منٹو نے اِس حد تک اپنی متاع سمجھا کہ اُس میں زائد لفظ کا استعمال بھی روا جانا — شعر ہے:

کون ہے جو نہیں ہے حاجت مند
کس کی حاجت روا کرے کوئی

منٹو کی تحریر میں مصرعۂ ثانی کا برتاؤ درجِ ذیل ہے:

''تین مہینے ہسپتال میں رہا ہوں، جنرل وارڈ میں تھا۔ مجھے وہاں آپ کی کوئی امریکی امداد نہ ملی، میرا خیال ہے آپ کو میری بیماری کی کوئی اطلاع نہیں ملی ورنہ آپ ضرور وہاں سے دو تین پیٹیاں ٹیرامائی سین کی روانہ کر دیتے اور ثوابِ دارین حاصل کرتے۔

ہماری فورن پبلسٹی بہت کمزور ہے۔ اس کے علاوہ ہماری حکومت کو ادیبوں، شاعروں اور مصوّروں سے کوئی دلچسپی نہیں آخر:

کس کس کی حاجت روا کرے کوئی

ہماری پچھلی مرحوم گورنمنٹ تھی۔ جنگ شروع ہوئی تو انگریز بہادر نے فردوسیِ اسلام حفیظ جالندھری کو سونگ پبلسٹی ڈیپارٹمنٹ کا ڈائریکٹر بنا کر ایک ہزار روپیہ ماہوار مقرر کر دیا۔ پاکستان بنا تو اس کو صرف ایک کوٹھی اور شاید ایک پریس الاٹ ہوا۔ اب بے چارہ

اخباروں میں اپنا رونا رو رہا ہے کہ ترانہ کمیٹی نے اس کو نکال باہر کیا۔ حالانکہ سارے پاکستان میں اکیلا وہی شاعر ہے جو دنیا کی اِس سب سے بڑی اسلامی سلطنت کے لیے قومی ترانہ لکھ سکتا ہے اور اس کی دُھن بھی تخلیق کر سکتا ہے۔

اس نے اپنی انگریزی بیوی کو طلاق دے دی ہے اس لیے کہ انگریزوں کا زمانہ ہی نہیں رہا۔ اب سنا ہے کہ امریکی بیوی کی تلاش میں ہے۔ چچا جان! خدا کے لیے اس کی مدد کیجیے۔ ایسا نہ ہو کہ غریب کی عاقبت خراب ہو۔'' (۲۹)

✦

''چچا سام کے نام پانچواں خط'' کا آخری جزو ''احوالِ روزگار'' پر مشتمل ہے جسے پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ تحریر کے وقت، منٹو کے ذہن میں غالب کے کئی شعر بیک وقت کار فرما تھے۔ اِس میں درج شعر پڑھتے ہوئے اِس سے ماخوذ صادقین کی وہ پینٹنگ یاد آتی ہے جس میں ''ترے خیال'' کے لیے گلاب کی صورت گہرا سرخ رنگ، ناظر کے ذہن میں ''محبوب'' کے ساتھ ساتھ ''تخلیق'' کا تصور بھی پیدا کرتا ہے:

''اب میں احوالِ روزگار کی طرف آتا ہوں، چچا جان! آپ کی ریشِ مبارک کی قسم، دن بہت بُرے گزر رہے ہیں۔ اتنے بُرے گزر رہے ہیں کہ اچھے دنوں کے لیے دعا مانگنا بھی بھول گیا ہوں۔ یہ سمجھیے کہ بدن پر لتّے جھولنے کا زمانہ آ گیا ہے، کپڑا اتنا مہنگا ہو گیا ہے کہ جو غریب ہیں ان کو مرنے پر کفن بھی نہیں ملتا، جو زندہ ہیں وہ تار تار لباس میں نظر آتے ہیں۔ میں نے تو تنگ آ کر سوچا ہے کہ ایک ''ننگا کلب'' کھول دوں، لیکن سوچتا ہوں ننگے کھائیں گے کیا — ایک دوسرے کا ننگ؟ — مگر وہ بھی اتنا کریہہ ہوگا کہ نگاہیں لقمہ اٹھاتے ہی دہیں رکھ دیں گی۔

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے کوئی تنگی سی تنگی ہے کوئی ترشی سی ترشی ہے لیکن چچا جان داد دیجیے:

گو میں رہا رہینِ ستم ہائے روزگار
لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

لیکن چھوڑیے اس قصے کو۔ آپ خوش گلو، خوش اندام اور خوش خرام حسینوں کا وہ خیر سگالی وفد بھیج دیجیے۔ ہم اس غربت میں بھی اپنا جی ''پشوری'' کرلیں گے...'' (۳۰)

✦

غالب نے خلقی تونگری کے برعکس اپنی تنگ دستی کے بارے میں لکھا ہے:

''...ایثار وکرم کے جو دواعی، میرے خالق نے مجھ میں بھر دیے ہیں، بہ قدرِ ہزار، ایک ظہور میں نہ آئے ...نہ وہ دست گاہ کہ ایک عالم کا میزبان بن جاؤں اگر تمام عالم میں نہ ہوسکے، نہ سہی، جس شہر میں رہوں اُس شہر میں تو بھوکا ننگا نظر نہ آئے...'' (۳۱)

غالب کے ہم نفس منٹو کا کہنا ہے:

''میں کچھ بھی ہوں، بہرحال مجھے اتنا یقین ہے کہ میں انسان ہوں۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ مجھ میں برائیاں بھی ہیں اور اچھائیاں بھی۔ میں سچ بولتا ہوں لیکن بعض اوقات جھوٹ بھی بولتا ہوں۔ نماز یں نہیں پڑھتا لیکن سجدے میں نے کئی دفعہ کیے ہیں۔ کسی زخمی کتے کو دیکھ لوں تو گھنٹوں میری طبیعت خراب رہتی ہے لیکن مجھے ابھی تک اتنی توفیق نہیں ہوئی کہ میں اسے اٹھا کر اپنے گھر لے آؤں اور اس کا علاج معالجہ کروں۔ کسی دوست کو مالی مشکلات میں گرفتار دیکھتا ہوں تو میرے دل کو بہت دُکھ ہوتا ہے لیکن میں نے اکثر ایسے موقعوں پر اس دوست کی مالی امداد نہیں کی، اس لیے کہ مجھے شراب خریدنا ہوتی تھی۔ مجھے کسی اپاہج لڑکی سے ملنے کا اتفاق ہو تو میرے دل ودماغ میں طوفان برپا ہوجاتا ہے میں اپاہج بن کر اس کی جگہ اختیار کرکے گھنٹوں سوچتا ہوں، اس کی زندگی کے المیے کے متعلق غوروفکر کرتا ہوں۔ پھر معاً تہیہ کرتا ہوں کہ میں اس سے شادی کرلوں گا۔ مگر یہ تہیہ فوراً غائب ہوجاتا ہے جب میں اس کا ذکر اپنی بیوی سے کرتا ہوں۔'' (۳۲)

✦

بے بسی ولاچاری کے بیشتر لمحوں میں منٹو نے غالب کو اپنا ہم نفس پایا۔ ادب کے حامیوں اور سرکاروں کی خاص عدالتوں سے اٹھائے دکھوں کو ''لذّتِ سنگ'' اور ''زحمتِ مہرِ درخشاں'' کے عنوان اُسے کلامِ غالب نے ہی دیے:

سر کھجاتا ہے جہاں زخمِ سر اچھا ہوجائے
لذّتِ سنگ باندازۂ تقریر نہیں

لرزتا ہے مرا دل زحمتِ مہرِ درخشاں پر
میں ہوں وہ قطرۂ شبنم جو ہو خارِ بیاباں پر

✦

غالب کے شعر نے ہی منٹو کو ایک مجموعے کے نام کے لیے اپنے عہد کا ایک لقب ''نمرود کی خدائی'' سُجھایا:

کیا وہ نمرود کی خدائی تھی
بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا

✦

۲۸؍اکتوبر ۱۹۵۱ء کو اپنے افسانوں کے مجموعے ''یزید'' کا اختتامیہ ''جیبِ کفن'' منٹو نے غالب کے اِس شعر سے آغاز کیا تھا:

فارغ مجھے نہ جان کہ مانندِ صبح و مہر
ہے داغِ عشق زینتِ جیبِ کفن ہنوز

اختتامیہ کے ایک پارے میں منٹو نے لکھا ہے:

''میں آج بہت افسردہ ہوں — پہلے مجھے ترقی پسند تسلیم کیا جاتا تھا۔ بعد میں ایک دم مجھے رجعت پسند بنا دیا گیا، اور اب فتوے دینے والے سوچ رہے ہیں اور پھر سے یہ تسلیم کرنے کے لیے آمادہ ہو رہے ہیں کہ میں ترقی پسند ہوں — اور فتووں پر فتوے دینے والی سرکار مجھے ترقی پسند یقین کرتی ہے، یعنی ایک ''سُرخا'' — ایک کمیونسٹ، کبھی کبھی جھنجھلا کر

مجھ پر فحش نگاری کا الزام لگا دیتی ہے اور مقدمہ چلا دیتی ہے۔ دوسری طرف یہی سرکار اپنی مطبوعات میں یہ اشتہار دیتی ہے — کہ سعادت حسن منٹو ہمارے ملک کا بہت بڑا ادیب اور افسانہ نگار ہے جس کا قلم گذشتہ ہنگامی دور میں بھی رواں دواں رہا — میرا افسردہ دل لرزتا ہے کہ متلوّن مزاج سرکار خوش ہو کر ایک تمغہ میرے کفن سے ٹانک دے گی جو میرے داغِ عشق کی بہت بڑی توہین ہوگی۔'' (۳۳)

✦

پاکستان سرکار کی جانب سے منٹو کو بعد از مرگ نشانِ امتیاز کا اعلان (۱۴/اگست ۲۰۱۲ء) منٹو کی خودشناسی و پیش بینی کی ایک اور تصدیق ہے۔ پتھر میں گدی اِس تصدیق کی طرح — جو منٹو نے شعرِ غالب: ''یارب زمانہ مجھ کو مٹاتا ہے کس لیے؛ لوحِ جہاں پہ حرفِ مکرر نہیں ہوں میں'' کو اپنی متاع مان کر تحریر کی تھی:

۷۸۶

میری قبر کا کتبہ

یہ

لوح

سعادت حسن منٹو

کی

قبر کی ہے

جو اَب بھی سمجھتا ہے کہ اس کا نام

لوحِ جہاں پہ

حرفِ مکرّر نہیں تھا

(۳۴)

✦

۱۸ جنوری ۱۹۵۵ کے چند روز بعد، حفیظ ہوشیار پوری نے مادّہ تاریخِ وفات کے لیے کاوش کی تو انھیں غالب کا ایک ایسا مصرع دستیاب ہوا جس میں گویا منٹو بھی اپنے معاصرین سے مخاطب ہے: مژدہ باد اہلِ ریا کہ زمیداں رفتم۔ حفیظ نے مصرع کے عدد ۱۳۶۸ شمار کیے اور اِن میں، صنعتِ تعمیہ کے اعتبار سے ''آہ'' کے چھ عدد شامل کیے جس سے منٹو کا سالِ وفات ۱۳۷۴ھ حاصل ہوا:

چوں سعادت زجہاں رفت ہمی گفت حفیظ
تشنہ از خُم کدۂ عالمِ امکاں رفتم
خواند ایں مصرعِ تاریخ ز غالب با آہ/۶
''مژدہ باد اہلِ ریا کہ زمیداں رفتم''

۱۳۶۸ + ۶ = ۱۳۷۴ھ　　(۳۵)

یہ قطعۂ تاریخِ وفات، حفیظ ہوشیار پوری کے لیے ہاتفِ غیبی کی سرگوشی محسوس ہوتا ہے— غالب اور منٹو کے لیے بھی تو ''مضامین'' اُس کے ذریعے آتے تھے۔

حواشی

(۱)　افسانوی تجربہ اور اظہار کے تخلیقی مسائل۔ مکتی بودھ (مکتبہ جامعہ لمٹیڈ، نئی دہلی، ۱۹۸۲ء) ص:۱۰۔

(۲)　'آپ کا سعادت حسن منٹو (منٹو کے خطوط)' مرتب محمد اسلم پرویز (بلیک ورڈس پبلی کیشنز، تھانے، جنوری ۲۰۱۲) ص:۵۶۔

(۳)　زخمتِ مہرِ درخشاں۔ ٹھنڈا گوشت (مکتبہ جدید، لاہور، ۱۹۵۰ء) ص:۱۵۔

(۴)　منٹو کے زمان و مکاں۔ منٹو: حقیقت سے افسانے تک (دلّی کتاب گھر، دہلی، اکتوبر ۲۰۱۲) صص:۲۸۱ تا ۲۸۲۔

(۵)　آپ کا سعادت حسن منٹو… ص:۱۲۱۔

(۶) ایضاً۔صص:۱۲۱تا۱۲۲۔

(۷) ایضاً۔ص:۱۲۳۔

(۸) ایضاً۔ص:۱۲۵۔

(۹) ایضاً۔ص:۱۴۴۔

(۱۰) منٹونما (سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور۱۹۹۹ء) ص:۴۹۹۔

(۱۱) ایضاً۔صص:۵۰۱تا۵۰۲۔

(۱۲) ایضاً۔صص:۵۰۲تا۵۰۳۔

(۱۳۔۱۴۔15) ص:۵۰۳۔

(۱۶) ایضاً۔ص:۴۹۱۔

(۱۷) ایضاً۔صص:۴۹۱تا۴۹۲۔

(۱۸) ایضاً۔ص:۴۹۲۔

(۱۹) ایضاً۔صص:۴۹۲تا۴۹۴۔

(۲۰) ایضاً۔صص:۴۹۵تا۴۹۶۔

(۲۱) ایضاً۔ص:۵۰۴—— سرنامہ میں منٹو نے غالب کے جس خط، بنام مرزا حاتم علی مہر، کا ذکر کیا ہے اُس کی اصل عبارت یوں ہے:''...بھئی ''مغلچے'' بھی غضب ہوتے ہیں۔جس پر مرتے ہیں، اُس کو مار رکھتے ہیں۔ میں بھی ''مغلچہ'' ہوں۔ عمر بھر میں ایک بڑی ستم پیشہ ڈومنی کو میں نے بھی مار رکھا ہے...'' (غالب کے خطوط، جلد دوم۔مرتبہ: خلیق انجم۔ص:۷۲۳)

(۲۲) ایضاً۔صص:۵۰۴تا۵۰۵۔

(۲۳) منٹو کے مضامین (ساقی بک ڈپو، دہلی۔۱۹۹۷ء) ص:۹۔

(۲۴) ایضاً۔ص:۲۹۔

(۲۵) منٹو کہانیاں (سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور۲۰۰۰ء) صص:۶۱۰ تا ۶۱۲۔

(۲۶) اوپر، نیچے اور درمیان (مکتبہ اردو ادب، لاہور۔ بار سوئم: ۱۹۸۴ء) صص: ۱۶۲ تا ۱۶۳۔

(۲۷) ایضاً۔ ص: ۹۵۔ شعرِ غالب کی درست لفظیات: میں بلاتا تو ہوں اُس کو مگر اے جذبۂ دل؛ اُس پہ بن جائے کچھ ایسی کہ بن آئے نہ بنے۔

(۲۸) ایضاً۔ ص: ۹۶۔

(۲۹) ایضاً۔ صص: ۱۹۶ تا ۱۹۷۔

(۳۰) ایضاً۔ صص: ۲۲۹ تا ۲۳۰۔

(۳۱) خط بنام نواب علاؤالدین احمد خاں علائی (غالب کے خطوط، جلد اوّل۔ مرتبہ: خلیق انجم) ص: ۴۱۷۔

(۳۲) دو گڑھے۔ اوپر، نیچے اور درمیان۔ ص: ۲۳۲۔

(۳۳) یزید (مکتبہ جدید، لاہور۔ پہلی بار: نومبر ۱۹۵۱) ص: ۲۰۱۔

(۳۴) سعادت حسن منٹو: حیات اور کارنامے۔ ڈاکٹر برج پریمی (مرزا پبلی کیشنز، سری نگر، ۱۹۸۶ء) صص: ۳۷۸ تا ۳۷۹۔

(۳۵) ایضاً۔ ص: ۳۷۸۔

✦✦✦

ڈاکٹر ابرار رحمانی

غالب پر کلیم الدین احمد کی ایک نظر

بلا شبہ غالب اردو شاعری کی آبرو ہیں۔ غالب اور غزل ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم ہیں۔ غالب کی کل کائنات ایک مختصر سے دیوان پر محیط ہے اور کلیم الدین احمد کی تنقید کی شروعات ہی غزل کی مخالفت سے ہوتی ہے، جب انہوں نے اپنے والد عظیم الدین احمد کے شعری مجموعہ 'گل نغمہ' کو ترتیب دیتے ہوئے کہا تھا کہ ''غزل نیم وحشی صنف سخن ہے'' تو اردو دنیا میں ایک ہلچل مچ گئی اور پھر اردو شاعری پر کلیم الدین احمد کی تنقید غزل اور نظم کے بیچ معرکہ آرائی کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔

آیئے ہم غالب کی اس غزل کا مطالعہ کریں جسے کلم الدین احمد نے اپنی بات کی تائید میں پیش کرتے ہوئے کہا تھا کہ'' ان کی باتوں میں کوئی معقول مناسبت نہیں۔ ان میں وہ ربط وتسلسل وہ ارتقائے خیال نہیں'' غالب کی غزل ہے۔

غیر لیں محفل میں بوسے جام کے — ہم رہیں یوں تشنہ لب پیغام کے
خستگی کا تم سے کیا شکوہ کہ یہ — ہتھکنڈے ہیں چرخ نیلی فام کے
خط لکھیں گے، گرچہ مطلب کچھ نہ ہو — ہم تو عاشق ہیں تمہارے نام کے
رات پی زمزم پہ مے اور صبح دم — دھوئے دھبے جامۂ احرام کے
دل کو آنکھوں نے پھنسایا کیا مگر — یہ بھی حلقے ہیں تمہارے دام کے
شاہ کے ہے غسل صحت کی خبر — دیکھئے کب دن پھریں حمام کے

عشق نے غالب نکما کردیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

کلیم الدین احمد کے اعتراضات کے برعکس اس غزل میں ربط، تسلسل اور ارتقائے خیال سبھی کچھ ہیں۔ غالب اس غزل میں کہتے ہیں کہ رقیبوں یا غیروں کی کامیاب قسمت دیکھ کر شاعر خستہ حال نظر آتا ہے۔ پھر اپنے معشوق کو خط لکھنے کا ارادہ کرتا ہے اور دیوانگی میں زمزم پر میکشی کرتا ہے۔ دیوانگی جب حد سے بڑھتی ہے اور دل آنکھوں میں جا پھنستا ہے تو شاعر کی حالت کچھ اور غیر ہو جاتی ہے۔ وہ بیمار ہو جاتا ہے لیکن وہ اپنے معشوق کو اس کی خبر لگنے نہیں دینا چاہتا۔ لہٰذا شاہ کی آڑ میں حمام کے دن پھرنے کی آرزو کرتا ہے۔ اس دیوانگی اور بیماری کا لازمی نتیجہ شاعر کے نکما ہونے کی صورت میں سامنے آتا ہے۔

ہم دیکھ سکتے ہیں کہ اس غزل کی مذکورہ باتوں میں ربط اور معقول مناسبت پائی جاتی ہے اور ساتھ ہی اس غزل کا ہر شعر اپنے آپ میں بھی مکمل ہے۔ لیکن کوئی ضروری نہیں کہ ہر غزل کے اشعار میں کوئی شعوری یا غیر شعوری ربط پایا ہی جائے۔

جہاں تک غالب کی عظمت کا سوال ہے تو غالب کلیم الدین احمد کی نظر میں اردو کے تما شعرا سے برتر ہیں۔ جذبات کی بلندی اور تخیل کی پرواز اوروں کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہے۔ غالب اس معاملے میں کلیم الدین احمد کی نظر میں سودا سے بہت ملتے جلتے ہیں لیکن بہت سارے معاملات میں وہ سودا پر بھی فوقیت رکھتے ہیں۔ کلیم الدین احمد کہتے ہیں:

> ''غالب کا دماغ بلند اور تخیل وسیع تھا۔ ان کا مطمع نظر تنگ و محدود نہ تھا۔ اس لیے وہ مروجہ مضامین غزل پر قناعت نہیں کرتے اور اکثر فلسفیانہ مضامین کو داخل شعر کرتے ہیں اور قدرت نے ان کو یہ قوت عطا کی تھی کہ وہ مصنوعی جذبات و خیالات کو جوش کے ساتھ محسوس کر سکیں۔ اس لحاظ سے وہ سودا سے برتر تھے۔'' (اردو شاعری پر ایک نظر، صفحہ 173)

غالب کی شاعری میں تازگی اور شگفتگی کے ساتھ ساتھ نئی تشبیہات اور نئے استعارے اس بات کی غمازی کرتے ہیں کہ غالب کے یہاں جذبات و خیالات اصلی ہیں اور ان کی پیش کش میں آمد

ب آ ود رنہیں۔ غالب کی مربوط اور قطعہ بند غزلیں کلیم الدین احمد کے لیے خاص کشش رکھتی ہیں۔ اس ضمن میں ایک بہت خاص غزل جو ''مرثیہ عارف'' کے نام سے مشہور ہے، کلیم الدین احمد اسے نقل کرتے ہیں:

لازم تھا کہ دیکھو مرا رستہ کوئی دن اور
تنہا گئے کیوں اب رہو تنہا کوئی دن اور
آئے ہو کل اور آج ہی کہتے ہو کہ جاؤں
مانا کہ ہمیشہ نہیں، اچھا کوئی دن اور
جاتے ہوئے کہتے ہو تو قیامت کو ملیں گے
اخوب! قیامت کا ہے، گویا کوئی دن اور کی

کلیم الدین احمد کو اس غزل میں اس لیے ربط نظر آتا ہے کہ یہ پوری غزل ایک ہی واقعہ کے گرد گھومتی ہے لیکن یہ ربط وتسلسل ناگزیر نہیں ہے۔ اس کی خاص وجہ کلیم الدین احمد کی نظر میں یہ ہے کہ ''اس غزل میں خیالات وجذبات کی ابتدا ترقی اور انتہا نہیں۔'' غزلوں میں یہ سارا ربط اور تسلسل کلیم الدین احمد کا وہ مطالبہ ہے جو وہ ہمیشہ کرتے رہے ہیں۔ البتہ اس غزل میں ربط کے ضمن میں ایک بات پتے کی کہی ہے:

''دوسرا اور تیسرا شعر مطلع سے پہلے ہونا چاہیے۔'' (ایضا، 174)

لیکن کیا واقعی غزل میں ایک خاص ترتیب ضروری ہے؟ اس غزل (مرثیہ عارف) کے ضمن میں ایک سوال یہ بھی کیا جا سکتا ہے کہ جب غزل اور مرثیہ دو الگ الگ اصناف ہیں تو پھر ایک ہی چیز کو مرثیہ سمجھتے ہوئے غزل میں کس طرح شامل کیا جا سکتا ہے؟ اور کیا غزل اور مرثیہ متحد ہو سکتے ہیں؟ دیوان غالب میں یہ مرثیہ بطور غزل شامل ہے۔ کلیم الدین احمد نے بھی اسے غزل کے طور پر ہی لیا ہے۔ لیکن اسکولوں کے نصاب میں یہ بطور مرثیہ شامل ہے اور اس مرثیے کے حوالے سے مرثیہ کی تعریف طلبہ کو ذہن نشین کرائی جاتی ہے۔ کیا یہ امر قابل غور نہیں؟

کلیم الدین احمد نے غالب کے کلام کا خاص نقص ان کے اسلوب کی ناہمواری بتایا ہے، جو وقت کے ساتھ ساتھ بدلتا ہے۔ فارسیت کا غلبہ ان میں سے ایک ہے۔ غالب کی یہ غزل:

شبنم بہ گل لالہ نہ خالی زادا ہے　　داغ ِ دلِ بیدرد نظر گاہِ حیا ہے

دل خوں شدہ ٔ کشمکش ِ حیرت ِ دیدار　　آئینہ بدستِ بتِ بدمستِ حنا ہے

تمثال میں تیری ہے وہ شوخی کہ بصد شوق　　آئینہ بد اندازِ گل آغوش کشا ہے

مجبوری وہ دعوائے گرفتاریِ الفت　　دست تہہ سنگ آمدہ پیمانِ وفا ہے

اس غزل میں کلیم الدین احمد نے بجا طور پر چند اردو الفاظ جوڑ دینے کو بے موقع کہا ہے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں:

''پہلے، دوسرے اور چوتھے شعر میں 'اگر' ہے' کو بدل دیا جائے تو پھر یہ شعر اردو کے باقی نہ رہیں گے۔ بندشیں تمام فارسی ہی کی ہیں۔'' (ایضاً 177)

لیکن غالب اس دور میں سانس لے رہے تھے جب فارسی کا دور دورہ تھا اور فارسی دانی اظہار قابلیت کی دلیل تھی۔ لہٰذا غالب کے یہاں فارسیت کا ہونا بہت زیادہ غیر فطری نہیں۔ (البتہ اس غلطی کے مرتکب خود کلیم الدین احمد اس وقت نظر آتے ہیں جب وہ اقبال کے 'جاوید نامہ' کا منظوم اردو ترجمہ کرتے ہیں اور ترجمہ کا حق ادا نہیں کرتے جب کہ ترجمہ کرتے ہوئے اس بات کا خاص خیال رکھنا ہوتا ہے کہ پورے طور پر ترجمہ ہو جائے۔ اقبال کا شعر اور کلیم الدین احمد کا ترجمہ ملاحظہ کریں:

بے تجلی زندگی رنجوری است
عقل مہجوری و فصل دیں مجبوری است

اب ترجمہ دیکھیے

بے تجلی زندگی اپنی ہے آزار دوام
عقل مہجوری سراسر، دیں ہے مجبوری تمام

یہاں بھی محض 'است' کا ترجمہ کردیا گیا ہے اور دوام تمام کا اس پر اضافہ کیا گیا۔

بہرحال یہ بات محض جملہ معترضہ کے طور پر کہی گئی ہے۔) غالب کے کلام کا دوسرا رنگ اس کے بالکل برعکس ہے یعنی فارسیت کے غلبہ کے مقابلے دوسری جانب انتہائی سادگی ہے۔

ابن مریم ہوا کرے کوئی
میرے دکھ کی دوا کرے کوئی

یہ اس دوسرے رنگ کی نمائندہ غزلوں میں سے ایک ہے۔ اس رنگ میں سیدھے اور معمولی الفاظ میں اختصار کے ساتھ اس طرح پیش کش ہوتی ہے کہ مفہوم بہ آسانی سمجھ میں آجاتا ہے۔ غالب کے کلام کا تیسرا رنگ ان دونوں کے بیچ کا ہے۔ کلیم الدین احمد نے اس رنگ کی غزل کے طور پر یہ پیش کیا ہے:

غم ہستی کا اسد کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

کلیم الدین احمد نے اس رنگ کو پہلے دونوں رنگوں پر ترجیح دی ہے۔ اس لیے کہ اس میں زیادہ گنجائش اور وسعت ہے اور پھر اس میں ترنم کا بھی فقدان نہیں۔

اسلوب کی ناہمواری کے ساتھ ساتھ کلیم الدین احمد غالب کے ہاں مضامین میں بھی ناہموار پاتے ہیں۔ مختلف اور متنوع قسم کے مضامین سے کلیم الدین احمد کی طبیعت مکدر ہو جاتی ہے:

''کہیں وہ اعلیٰ فلسفیانہ خیالات کو حلقہ شعر میں کھینچ لاتے ہیں تو کہیں وقیع صوفیانہ تصورات کو پر جوش و پر اثر طریقہ سے بیان کرتے ہیں۔ کہیں گہرے اور نفیس کوائف کی ترجمانی کرتے ہیں تو کہیں مشاہدۂ عالم کا تازہ اور شگفتہ نقشہ کھینچتے ہیں لیکن اس بو قلمونی کے ساتھ وہ پرانے اور فرسودہ خیالات، مروجہ عشقیہ جذبات کو عامیانہ اور رکیک طور پر نظم بھی کرتے ہیں۔ اس ناہمواری کی وجہ سے طبیعت مکدر ہو جاتی ہے۔''

(ایضاً 176)

کلیم الدین احمد نے یہاں بھیڑ بکری کو ایک ساتھ کر دیا ہے۔ بوقلموں مضامین اور اس کی بو قلمونی کے ساتھ پیش کش غالب کے آرٹ کی خصوصیت ہے۔ البتہ فرسودہ خیالات اور مروجہ عشقیہ جذبات عامیانہ پیش کش نقص ہے۔ لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ پہلے قسم کے مضامین بھی ناہموار ہیں اور اس سے طبیعت مکدر ہوتی ہے اور اگر یہ بات ہوتی تو پھر 'غالب مخصوص آرٹ کے مالک' کس طرح ہو جاتے ہیں۔ غزل کے ہر شعر میں ایک جہان معنی پنہاں ہوتا ہے۔ اس چھوٹے سے کوزے میں دریا موجیں مار رہا ہوتا ہے۔ کلیم الدین احمد نے غزل کی اس خوبی کا اعتراف غالب کے حوالے سے کیا ہے جو غزل اور غالب کے آرٹ کی بہترین تعریف بھی ہے۔ ملاحظہ کریں۔ کلیم الدین احمد کہتے ہیں:

> ''غالب کوشش کرتے ہیں کہ ایک شعر میں مختلف خیالات و جذبات یا ایک ہی خیال، ایک ہی جذبہ کے مختلف پہلوؤں کو سمیٹ لائیں۔ اس ارادے میں جامعیت کے ساتھ تو کامیابی ممکن نہیں لیکن وہ ایک ترکیب استعمال کرتے ہیں جس سے مشکل آسان ہو جاتی ہے۔ چند خیالات تو پوری طرح ایک شعر میں نظم نہیں ہو سکتے، لیکن غالب ایک بات کو کچھ اس طرح بیان کرتے ہیں کہ دوسری باتوں کی طرف توجہ جا پڑتی ہے اور شعر پڑھ کر ذہن ان دوسری باتوں کی جستجو میں لگ جاتا ہے۔ گویا محشرستان خیال کا دروازہ کھل جاتا ہے اور غالب کا شعر اس دروازے کی کلید ہے۔ اگر آپ دریا کے کنارے کھڑے ہو کر دریا کا نظارہ کیجئے تو ممکن ہے کہ دریا کی سطح پر آپ کو کامل سکون نظر آئے، پھر پتھر کا ایک ٹکڑا اٹھا کر پھینک ماریے تو سطح دریا پر ایک لہر نمودار ہوگی۔ یہ لہر دوسری لہروں کو بیدار کرے گی۔ لہروں کا دائرہ بڑھتا جائے گا، ایک بھنور کی سی کیفیت نمایاں ہوگی اور یہ لہریں پھیلتے پھیلتے نظروں سے غائب ہو جائیں گی۔ غالب کے اشعار دریائے تخیل میں اسی قسم کی لہریں پیدا کرتے ہیں۔ (ایضاً 188)

لیکن کیا غالب کے اشعار سے پیدا شدہ لہریں بھی عام لہروں کی طرح غائب ہو جاتی ہیں اور

ذہن پر کوئی تاثر نقش نہیں ہوتا؟ کلیم الدین احمد نے اس طرف اشارہ نہیں کیا ہے۔

غالب کے دور کی محبوب ترین صنف شاعری غزل رہی ہے۔ چنانچہ غالب نے بھی اسی کو اپنایا لیکن غالب نے غزل کی تنگی کا بھی اظہار کیا ہے:

بقدر شوق نہیں ظرف تنگنائے غزل

کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کے لیے

چنانچہ غالب نے کبھی کبھی دوسری اصناف میں بھی طبع آزمائی کی ہے لیکن غزل چونکہ مقبول ترین صنف تھی لہذا انہوں نے اس کو ترجیح دی۔ حتیٰ کہ عارف کا مرثیہ بھی لکھنا مقصود ہوا تو اسی ہیئت میں لکھا۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ''غالب مثنوی نہیں لکھ سکتے تھے یا ان میں تعمیری صلاحیت نہ تھی۔'' جیسا کہ کلیم الدین احمد کہتے ہیں، یا یہ کہ ''غالب قصیدہ کا مرد میدان نہیں ہو سکتا تھا۔'' وجہ صرف غزل کی مقبولیت تھی۔ چنانچہ غالب کے متعلق کلیم الدین احمد کی یہ رائے صحیح معلوم ہوتی ہے:

> ''غالب میں یہ سکت نہ تھی کہ وہ غزل سے کنارہ کش ہو کر نظیر کی طرح مربوط و مسلسل صنفوں میں اپنے تجربوں کو بیان کرتے۔ قصیدہ نہ سہی، مثنوی بھی نہ سہی لیکن اگر غالب کو غزل سے کامل بے اطمینانی ہوتی تو وہ بھی نظیر کی طرح مسدس، مخمس، مثلث وغیرہ میں اپنے خیالات و تجربات کا مربوط و مسلسل اظہار کرتے۔''

(اردو شاعری پر ایک نظر، صفحہ 182)

اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ جس طرح غالب غزل کے مرد میدان ہیں اسی طرح کلیم الدین احمد تنقید کا شتر بے مہار ہیں، جس پر قابو پانا ان کی حیات میں بھی مشکل تھا اور ان کے گزر جانے کے بعد بھی۔

✿✿✿

ڈاکٹر زیبا محمود

ہم سے بے علموں کو غالب سے کیا نزدیک تر

بڑا فنکار زماں و مکاں کی حدود توڑ کر اپنی عظمت کا لوہا منواتا ہے۔ آج بھی انھیں معنوں میں ایک فنکار ہے جس کا دامن شہرت وسیع تر ہوتا گیا۔ غالب کے بارے میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور لکھا جاتا رہے گا۔ ہر شارح نے شعریات غالب کی تشریح و تعبیر مختلف انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ دراصل غالب کا فن ہمارے محققین اور ان کی توجہ کا مرکز رہا ہے۔ یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ ہماری تحقیق و تنقید کا سب سے بڑا موضوع غالب ہے اس لئے قارئین کے جملہ طبقات کو شعری کیف مہیا کرانے میں کامیاب بھی ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی نے دانشوری کے تمام شاخوں میں کامرانی حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ غالب کے فکری رجحان کو ازسرنو سمجھنے کی کوش کی ہے۔ یہ بات مجھے کہنے میں ذرا بھی تامل نہیں کہ ناقدین کے یلغار کے درمیان شمس الرحمٰن فاروقی نے غالب کے شعری مزاج کو دریافت کیا اور نمایاں کامیابی حاصل کی ہے۔

شمس الرحمٰن فاروقی کی تصنیف 'تفہیم غالب' تشریح و تفہیم کے میدان میں اپنی مثال آپ ہے۔ اس کتاب میں شمس الرحمٰن فاروقی نے کلام غالب کو جن معیار و میزان پر پرکھا اس کا رقبہ وسعت آمیز ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی کا مشرقی زبانوں اور مشرقی شعریات کا مطالعہ بہت وسیع ہے۔ فارسی زبان و ادب سے ان کی واقفیت ان کی تحریر پڑھنے سے بہ آسانی معلوم ہو جاتی ہے ان کی شعر فہمی کا ایک زمانہ قائل رہا ہے شعر، شور انگیز ہو یا نقد غالب یا پھر تفہیم غالب ان کی شعر فہمی نے وہ کمالات دکھائے ہیں اور اس سمندر سے وہ آب گینے تلاش کرلائے ہیں کہ بس پڑھتے جائیے اور پڑھتے جائیے۔ فاروقی صاحب نے شارحین کی تنقید سے اختلاف کرتے ہوئے وہ معنی بیان

کئے ہیں جو ان کے خیال میں زیادہ قابل قبول ہیں۔ اس کتاب میں رقت نظر اور ژرف بینی نے انھوں نے کلام غالب کے محاسن اجاگر کئے ہیں اس سے ایک طرف ان کی شعر فہمی اور نگاہ کی تہ رسی کا اندازہ ہوتا ہے تو دوسری طرف غالب کی شاعری پر ان کی جچی تلی رائے بھی معلوم ہو جاتی ہے اور تیسری اہمیت یہ ہے کہ بعض اشعار میں انھوں نے واقعی ایسے پہلو تلاش کیے ہیں جن پر کسی شارح کی نظر نہیں پہنچتی تھی۔

شمس الرحمٰن فاروقی نے اپنے ایک چھوٹے سے جملے میں غالب کی حیثیت کو صحیح تاریخی تناظر میں سمیٹ لیا۔

''غالب ہمارے آخری بڑے کلاسیکی شاعر اور پہلے بڑے جدید شاعر ہیں۔''

تفہیم غالب کو 1989 میں غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی نے شائع کیا۔ 378 صفحات پر مشتمل اس کتاب میں اشعار کی کل تعداد 138 ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی نے تمام اشعار غالب پر بحث نہ کرتے ہوئے صرف ان اشعار کو موضوع گفتگو بنایا ہے۔ جن پر مزید غور وفکر کی اشد ضرورت کو محسوس کیا۔ فاروقی صاحب لکھتے ہیں کہ

> ''اظہار خیال کے لیے وہی اشعار منتخب ہوں جن میں کوئی ایسا نکتہ ہو جو عام شراح سے نظر انداز ہو گیا ہو یا جن کی شرح میں کوئی ایسی بات کہنا ممکن ہو جو متداول شروح سے ہٹ کر ہو۔'' (دیباچہ تفہیم غالب ص 14)

1969 میں غالب کی صد سالہ برسی کے موقع پر تقریبات اور تصنیفات کی اشاعت کا سلسلہ جو شروع ہوا اس سے فاروقی صاحب بھی متاثر ہوئے اور غالب کے اشعار کی تشریح وتعبیر کا سلسلہ اپنے رسالہ شب خون میں شروع کیا۔ وہ تفہیم غالب کے دیباچے میں لکھتے ہیں۔

> ''چنانچہ شب خون کے شمارہ نمبر 23 بابت ماہ اپریل 1928 سے تفہیم غالب کا سلسلہ شروع ہوا اور یہ کچھ اس قدر مقبول ہوا کہ غالب صدی تقریبات کے اختتام پزیر ہونے کے بعد قائم رہا۔ اس سلسلے کی آخری تفہیم شب خون شمارہ 151 بابت ماہ

ستمبر۔نومبر 1988 میں شائع ہوئی۔ گویا تفہیم غالب کے نام سے جو کتاب آپ کے ہاتھوں میں ہے اس کی مدت تصنیف بیس سال سے کچھ اوپر ہے۔ شب خون میں شائع تشریحات میں کچھ ضروری ترمیم و اضافہ کے ساتھ تفہیم غالب میں شامل کی گئی ہے۔''

فاروقی صاحب نے مزید واضح کیا کہ۔

''کتابی صورت میں پیش کرنے کی غرض سے میں نے تمام تفہیمات کو دوبارہ لکھا ہے اس معنی میں کہ ان میں اضافہ کیا ہے۔ بعض باتیں حذف کردی ہیں بعض باتوں کو زیادہ واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ بعض پہلوؤں پر تاکید بڑھادی ہے بعض پر کم کردی ہے۔ زبان کو بھی آسان بنانے کی کوشش کی ہے۔ یعنی اس وقت جو تحریریں آپ کے سامنے ہیں وہ شب خون میں شائع ہونے والی تحریروں سے جگہ جگہ لفظاً اور کئی جگہ معناً مختلف ہیں۔''

اس کتاب میں اشعار کے متن کے حوالے سے شمس الرحمٰن فاروقی لکھتے ہیں کہ۔

''اشعار کا متن عام طور پر نسخۂ عرشی (اشاعت اول) انجمن ترقی اردو علی گڑھ 1957 اشاعت دوم انجمن ترقی اردو دہلی 1982 کے مطابق ہیں۔'' (تفہیم غالب ص 11)

اور اشعار کی ترتیب کے بارے میں کہتے ہیں۔

''کتابی شکل میں جمع کرتے وقت میں نے اشعار کی ترتیب متداول دیوان کے مطابق کردی ہے۔ جناب کالی داس گپتا رضا نے اپنی معرکہ آرا ایڈیشن دیوان غالب کامل 1988 میں تمام اشعار زمانۂ تصنیف کے اعتبار سے جمع کیے ہیں۔ میں نے ان کی بیش قیمت تحقیق سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس کتاب میں شرح کردہ ہر شعر کے سامنے اس کا زمانۂ تصنیف لکھ دیا ہے۔'' (تفہیم غالب ص 19)

شمس الرحمٰن فاروقی کے یہ جملے ان کی ناقدانہ بصیرت کے غماز ہیں جہاں انھوں نے غالب کے فن پاروں کو استعارہ (MATAPHOR) سے تعبیر کیا ہے۔

''ان کا کلام اس صدی کا استعارہ اور ان کے بیان کردہ مسائل اس صدی کے مسائل کا جوہر ہے۔'' (ماہنامہ شب خون 2001)

اس تصنیف میں شمس الرحمٰن فاروقی کے خیالات بہت پر مغز ہیں جس کی روشنی میں مرزا غالب کے افکار و اظہار سے ان کے خیالات کی پاکیزگی ندرت اور اشعار میں نئے مسائل کی اور امکانات کی نشاندہی ممکن ہوسکی۔ غالب کے استفہامیہ ذہن پر فاروقی صاحب نے کافی غور وخوض کیا جو غالب فہمی کی جانب ان کی تنقیدی رویہ کو مزید مربوط و مستحکم کرتی ہیں۔ غالب کے اس ذہنی فضا کو سمجھنا ذوق شناسان ادب کے لیے ایکChallenge ضرور ہے اور اس جانب بھی شمس الرحمن فاروقی نے اپنا لوہا منوایا۔

شمس الرحمٰن فاروقی کی شرحیں ان کے اپنے مطالعے اپنے سمجھ اپنی علمی لیاقت کے لاثانی جوہر ہیں اور اسے انھوں نے بطور TECHNIQUE استعمال نہیں کیا اور تفہیم غالب کے قفل کو کھولنے میں سرخ روئی حاصل کی جسے غالب فہمی پر مزید ایک مستند ماخذ کا درجہ حاصل ہے تفہیم غالب کے دیباچے میں اپنے موقف کا یوں اعلان کرتے ہیں۔

> ''ہر وہ معنی جو شعر کے الفاظ سے برآمد ہوسکیں وہ صحیح ہیں۔ میں خود اس بات کا قائل ہوں کہ شعر کا ہم پہ یہ حق ہے کہ ہم اس کی ایک بہترین معنی تلاش کریں اور جتنے کثیر معنی شعر میں ممکن ہوں ان کو دریافت کریں۔ بڑے شعر کی خوبی ہی یہ ہے کہ وہ مختلف زبانوں اور مختلف تناظر میں بھی بامعنی رہتا ہے۔ ایسا اس وقت ہوسکتا ہے جب اس میں معنی کے امکانات کی کثیر ہو۔'' (تفہیم غالب ص 16)

متن کی تعبیر وتوضیح میں شمس الرحمٰن فاروقی کو یدطولیٰ حاصل ہے جس سے ان کی قوت تشریح کے واضح اور اساسی ثبوت فراہم ہوتے ہیں۔ تعبیر متن میں خلاق یا فنکار کی مرکزی حیثیت کو SCHLEER MACHER نے تسلیم کیا اس کے علاوہ HANS GEORGE GADAMER کو بھی ماہر شرحیات میں نمایاں مقام حاصل ہے اور اردو ادب میں شمس الرحمٰن فاروقی کا یہ حصہ ہے جس نے نہ صرف اس نکتے کو سمجھا بلکہ وہ اس روایت کی پاسداری کرتے نظر آتے ہیں اور تفہیم غالب کی بیشتر شرحیں اس کی دلکش مثالیں ہیں۔ تفہیم غالب کے دیباچے میں

اس کی فلسفیانہ وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''مشرقی شعریات یعنی وہ شعریات جس کے ہمارے کلاسیکی شعرأ نے شعوری یا غیر شعوری طور پر پابندی کی ہے وہ میری نظر میں بہت محترم و مستحسن ہے۔۔۔۔۔۔ میں اس نظریہ کا شدت سے قائل ہوں کہ کسی شاعری کی فہم اس وقت مکمل ہوسکتی ہے جس تک ہم اس شعریات سے واقف ہوں جس کی روشنی میں وہ شاعری خلق کی گئی ہے اور جس کی رو سے وہ بامعنی ہوتی ہے۔''

شمس الرحمٰن فاروقی نے نہ صرف متن TEXT کی باریکیوں کو رواج دینے کا سہرا انجام دیا بلکہ اس کے نشیب و فراز سے بھی آگاہ کیا۔ دراصل اس سے یہ بات صاف ظاہر ہے کہ فاروقی صاحب شیل ماخراور ڈھلتے DILTHEY کے تصور تعبیر متن سے خاصا اثر قبول کیا۔ ڈھلتے اس سلسلے میں رقم طراز ہیں۔

''شارح جو مصنف کے سلسلہ خیال پر نہایت احتیاط کے ساتھ غور وخوض کرتا ہے اور شعور کے بہت سے ایسے اجزأ کی نشاندہی کرتا ہے جو شاید خود مصنف کے لاشعور میں دبے ہوئے ہوں۔۔۔اس طرح وہ مصنف کو خود مصنف سے بہتر طریقے پر سمجھ سکتا ہے۔''

تفہیم غالب کا پہلا شعر جسے فاروقی صاحب نے تشریح کے قالب میں ڈھالا دراصل یہ دیوان غالب کا پہلا شعر ہے جس کا زمانہ تحریر 1816 درج ہے۔

نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا

اس شعر میں فاروقی صاحب نے غالبیات کے مشہور شارح طباطبائی کے اس مشہور اور قبول عام وخاص خیال سے اختلاف کیا ہے کہ ایران میں رسم ہے کہ دادخواہ کاغذ کے کپڑے پہن کر حاکم کے پاس جاتا ہے اور بڑے عالمانہ مگر دلچسپ طریقے سے مختلف معنی بیان کئے ہیں۔ طباطبائی سے اختلاف کے باوجود ان کی اہمیت کے وہ معترف ہیں۔ فرماتے ہیں

''اپنی تمام کمیوں کے باوجود طباطبائی کی شرح غیر معمولی کتاب ہے۔''(تفہیم غالب ص18)

انھوں نے پہلے مصرعے میں استعمال لفظ 'کس کی' کو استعجابیہ سے زیادہ استفہامیہ قرار دیا ہے اور لفظ شوخی کو کلیدی فقرہ قرار دیا ہے اور میر کے اس شعر کو

کوئی ہو محرم شوخی ترا تو میں پوچھو
کہ بزم عیش جہاں کیا سمجھ کے برہم کی

یہاں تک کہہ دیا کہ غالب کے ذہن میں یہ شعر رہا ہوگا لیکن غالب پر چربہ وغیرہ کسی قسم کا الزام عائد نہیں کیا فاروقی صاحب فرماتے ہیں۔

''لیکن خالق کائنات کی شوخی کا مضمون اور اس پر طرہ یہ کہ اس شوخی کو موضوع سوال بنانا اور ایسے شعر کو سر دیوان رکھنا یہ شوخی غالب سے ہی ممکن تھی۔'' (تفہیم غالب ص24)

شمس الرحمٰن فاروقی فکر ونظر اور معنی ومفہوم کی ایک ایسی کائنات کی تعمیر میں سرگرداں نظر آتے ہیں جو اہل ادب کو قابل قبول ہے۔غالب کے اس مشہور شعر میں

شور جولاں تھا کنار بحر پر کس کا کہ آج
گرد ساحل ہے بہ زخم موجۂ دریا نمک

میں افسانوی واقعات کے ایک تسلسل کو بخوبی سے واضح کیا گیا اور موضوع رفتار کا تجزیہ جس انداز میں پیش کیا اس کی نظیر نہیں ملتی اور غالب کی فکر میں حرکت کے پہلو تلاش کیے۔اور غالب کا یہ مشہور مصرعہ

''غالب یہ خوف ہے کہ کہاں سے ادا کروں''

میں فاروقی صاحب کی تمام تر توجہ کا مرکز لفظ غالب ہے جو براہ راست غالب کا تخلص ہے تو دوسری طرف یہ خوف ہے کہ کہاں سے ادا کروں۔اس امر کی نشاندہی نے شعر کی دلآویزی اور معنی آفرینی میں اضافہ کیا ہے۔اور غالب کا یہ شعر ۔

ہے آدمی بجائے خود اک محشر خیال
ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو

طباطبائی اور بے خود موہانی نے اس شعر میں عارفانہ مفہوم کی نئی جہت کو دریافت کیا اور فاروقی صاحب نے لفظ محشر کے تین معنی متعین کیے پہلا برانگیخت ہونا دوسر مردوں کا زندہ ہوکر جمع ہونا اور تیسرا لوگوں کا جمع ہونا۔ غالب نے اپنی طبیعت کے زور وجوش کو قابو میں رکھنے کی کوشش کی ہے وہ خود کہتے ہیں۔

رکتی ہے مری طبع تو ہوتی ہے رواں اور

اس قول سے جذبات اور تہذیب کی نشاندہی ہوتی ہے غالب کے یہاں فنکارانہ تصور اور تخلیقی عمل کی کارفرمائی ان کے فکر ونظر کی بیداری اور ذہن وادراک کی تیزی کے ساتھ ان کی طبیعت کی سلامت روی کا پتہ دیتی ہے اور اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ غالب نے ادب وفن کی مسلمہ روایات و اقدار اور شاعری کے بنیادی تقاضوں کو فراموش نہیں کیا بلکہ اقدار کو قبول کر کے پرانی روایات کی توسیع میں پیش پیش رہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی نے ہر شعر کا گہرائی سے مطالعہ کیا۔ ان کا خیال ہے کہ

''جدید نقاد انھیں (غالب) ایک ایسے علامتی نظام کا خالق ٹھہراتا ہے جس میں انسان کی مرکزی حیثیت بھی ایک مبہم علامت کی سی ہے جو ہے بھی نہیں لیکن ظاہر ہے کہ اس تشخیص تک پہنچنے کے لیے غالب کا کلام ایسے علامتی نظام کا حامل تھا تنقیدی فکر کے علاوہ اس بنیادی فکر کو کام میں لانا پڑے گا جو شاعر سے متاثر ہوئی ہے اور خود شاعری بھی جس سے متاثر ہوئی ہے۔۔۔ جدید نقاد نے غالب میں جو نئی باتیں ڈھونڈی ہیں یا غالب کی جو معنویت اب ثابت کی ہے وہ جدید عہد کی صورت حال کا ایک حصہ ہے اور اس کا وجود بھی جدید عہد میں ممکن تھا۔'' (غالب اور جدید فکر)

شمس الرحمٰن فاروقی غالب کی مشکل پسندی پر یوں اظہار خیال کرتے ہیں۔

''میں نے غالب کے کلام کے ساتھ مشکل کی صفت عام معنوں میں استعمال کی ہے ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ میں ان کے کلام کو مشکل نہیں بلکہ مبہم سمجھتا ہوں اور ابہام کو اشکال سے کہیں زیادہ بلند منصب کی چیز سمجھتا ہوں میری نظر میں اشکال عموماً

شعر کا عیب ہے اور ابہام شعر کا حسن۔'' (غالب کی تفہیم وتعبیر کے امکانات ص 374)

الغرض حالی سے لے کر طباطبائی آل احمد سرور، مالک رام، امتیاز علی عرشی، نثار احمد فاروقی۔ کالی داس گپتا رضا اور شمس الرحمن فاروقی تک جتنے شارحین گزرے سبھی نے شعریات غالب پر غائر نظر ڈالی اور پھر اہل ادب تک اس کی پر مغز تفہیم کی رسائی کو اپنا نصب العین سمجھا اور اس جانب فاروقی صاحب کی کاوش تفہیم غالب کو غالب فہمی پر ایک معتبر اور جامع دستاویز تسلیم کیا جاتا ہے جو قاری کو ذہن ودل کے نئے دریچے کھولنے پر آمادہ کرتی ہے اور غالب کے کلام سے حظ اٹھانے میں معاون بھی ہے۔ تفسیر وتشریح کا یہ ایک ایسا مرغذار ہے جس کی وقعت ہشت پہلو نگینے کی ہے جس سے معنی ومفہوم کی شعاعیں پھوٹتی ہیں۔ مختلف دلیلوں سے فاروقی صاحب نے کلام غالب کی نازک آفرینی اور نازک خیالی کے بہتر نمونے تلاش کر کے اہل ادب کے سامنے لاکر رکھ دیئے۔ فاروقی صاحب نے غالب کی شخصی ذہانت اور فطانت کو صفحۂ قرطاس پر بکھیر دیا۔ تعصب سے بے نیاز شمس الرحمن کی شرحیں جامع ہیں اور معقول شرح نگاری کے آپ میر کارواں ہیں اور اس طرح تفہیم غالب کو فاروقی کی فکر رسا کا بہترین نتیجہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ ادب کے سنجیدہ قاری کے لئے فاروقی کی تفہیم غالب کی شرحیں بیش بہا قیمتی سرمایہ ہیں جس سے تفسیر وتفہیم کے راستے مزید روشن ہوتے ہیں اور فاروقی صاحب اسے شرح وسط کے ساتھ منصۂ شہود پر لانے میں کامیاب بھی ہوئے۔ ان کی شرحیں غالب تنقید کے نئے جہات متعین کرتی ہیں۔ الغرض تفہیم وتنقید، تفہیم وتعبیر، افہام اور تفہیم کا جو سلسلہ شروع ہوا وہ شمس الرحمن فاروقی کی تفہیم غالب سے پایۂ تکمیل کو پہنچا، فاروقی کی ناقدانہ بصیرت، علمی دیانت اور مرزا غالب کی شخصیت اور فن کو سمجھنے کی غیر معمولی صلاحیت نے انھیں شارحین غالب کی صف میں بڑا مقام ومنصب عطا کیا ہے اور اس لیے پروفیسر جگن ناتھ آزاد کا یہ قول صادق ہے کہ۔

ہم سے بے علموں کو غالب سے کیا نزدیک تر
سوچتا ہوں کام یہ کتنا بڑا تو نے کیا

✿✿✿

ڈاکٹر علیم صبا نویدی

مرزا غالب اور اردو رباعی

اردو شاعری میں بعض صنفیں اور ہئیتیں شعرا کے لیے بہت مقبول و مانوس رہی ہیں۔ ان میں رباعی بھی ایک ہے اردو رباعی نے اپنا چراغ فارسی رباعی سے روشن کیا مگر اس نے فارسی رباعی کو بھی آگے چل کر اپنی پشت پر ڈال دیا البتہ فارسی کی قدیم روایات کا احترام کرتے ہوئے اردو رباعی گو شعراء نے اس کی ہئیت میں کسی طرح تبدیلی نہیں کی بلکہ اس ہیئت کو مزید سنوارا سجایا۔ اردو رباعیات ہندوستان کے ہر دور کی خصوصیات تغیرات اور انقلابات کی آئینہ دار ہیں اور اردو کے تمام ادوار کا بھی ان میں عکس ملتا ہے۔ چوں کہ اس میں فارسی رباعی کی روح پھونکی گئی ہے اس لئے اس میں فارسی رباعیات کی بہت ساری خصوصیات در آئی ہیں۔ ہیئت اور موضوع دونوں حیثیت سے فارسی رباعی اردو رباعی پر اثر انداز ہوئی ہے۔

قدیم فارسی رباعیات گو شعراء میں بعض کا نام اردو رباعی کے تاریخ گو لیتے رہتے ہیں۔ شبلی نعمانی، سید سلیمان ندوی، سلام سندیلوی، محمود شیرانی وغیرہ نے فارسی رباعیات پر بہت کچھ لکھا ہے اور ان کی وساطت سے اردو شعراء ایک حد تک فارسی رباعی گو شعراء سے متعارف ہوئے ہیں۔ قدیم فارسی رباعی گو شعرا میں ابو شکور بلخی، رودکی، سلطان ابو سعید ابوالخیر، شیخ ابوالحسن خرقانی، عمر خیام کے نام لیے جاتے رہے ہیں۔ خصوصی طور پر سلطان ابو سعید ابوالخیر کا نام گرامی بڑے احترام سے لیا جاتا ہے کیونکہ موصوف کا تعلق غزنوی دور میں بزرگ صوفیاء کرام سے تھا اور آپ کے دور کے صوفی شاعر شیخ ابوالحسن خرقانی سے آپ کو بہت گہرا روحانی رشتہ تھا۔ شیخ ابوالحسن خرقانی کے بادۂ عشق کی تندی و تیز عطا کرنے والوں میں سلطان ابو سعید ابوالخیر کو بہت

زیادہ عمل دخل تھا بلکہ یوں کہیں تو بے جا نہ ہوگا کہ آپ ہی کے اثر سے شیخ ابوالحسن خرقانی مستفیض ہوئے تھے۔ سلطان ابوسعید ابوالخیر ایک خدا رسیدہ بزرگ تھے۔ آپ نے اپنی زندگی کے چودہ سال جذب کے عالم میں گزار دئے اور جب ہوش میں آئے تو بھی ان پر سے جذب کا عالم پوری طرح نہیں ہٹا تھا۔ آپ کے کلام میں تصوف و مذہب کی بڑی چاشنی ملتی ہے۔ عمر خیام کو خمریات میں شہرت ملی تو ابوالخیر کو تصوف کے مضامین میں بہت پسند کیا گیا۔ ابوسعید کے ہاں تصوف کے علاوہ بھی بہت سے موضوعات ملتے ہیں عشق، تصوف، اخلاق، مذہب، فسفہ، سبھی طرح کے مضامین سے آپ کی رباعیات لبریز ہیں۔ غالباً اردو شعراء کو زیادہ متاثر کرنے میں ابوسعید کے بعد غالب نے بھی اہم کردار نبھایا ہے۔

مرزا غالب دور متوسط کے سب سے بڑے شاعر ہیں۔ غالب نے اپنی تمام شعری تخلیقات میں اپنی جدت پسندی، نازک خیالی، معنی آفرینی اور حقیقت طرازی کی بلند پروازی دکھائی ہے۔ غالب نے غزلیات کی طرف بہت زیادہ دھیان دیا ہے۔ دیگر اصناف سخن کی طرف وہ اتنا ہی دھیان دیتے تو ہر صنف میں وہ اپنا ثانی نہیں چھوڑتے۔ اسی لئے غالب کی رباعیات کو ہم اس ڈھنگ سے دیکھ نہیں پاتے جس ڈھنگ سے ان کی غزلوں کو دیکھتے ہیں۔ ہاں وہ رباعی میں اپنی ساکھ بنائے رکھتے ہیں اور وہ سینکڑوں شعراء سے اس صنف میں بہتر ہیں۔

غالب کی رباعیات میں مختلف موضوعات ملتے ہیں مثلاً عارفانہ و متصوفانہ رباعیات، عشقیہ رباعیات، اخلاقی رباعیات، ذاتی رباعیات وغیرہ۔ ذیل میں ان کی چند رباعیات درج ہیں جن سے ان کے مقام کا تعین کر سکتے ہیں۔

ہر چند کہ دوستی میں کامل ہونا ممکن نہیں یک زباں و یک دل ہونا
میں تجھ سے اور مجھ سے تو پوشیدہ ہے مفت نگاہ کا مقابل ہونا

سامان ہزار، جستجو یعنی دل ساغر کش خوں آرزو یعنی دل
پشت و رخِ آئینہ ہے دین و دنیا منظور ہے دوجاں سے تو یعنی دل

اے کثرتِ فہم بے شمار اندیشہ
ہے اصل خرد سے شرمسار اندیشہ
یک قطرۂ خواں و دعوتِ صد نشتر
یک وہم عبادت ہزار اندیشہ

آتش بازی ہے جیسے شغلِ اطفال
ہے سوز جگر کا بھی اس طور کا حال
تھا موجد عشق بھی قیامت کوئی
لڑکوں کے لئے گیا ہے ایک کھیل نکال

دل سخت نژند ہوگیا ہے گویا
اس سے گلہ مند ہوگیا ہے گویا
پر یار کے آگے بول سکتے ہی نہیں
غالبؔ منہ بند ہوگیا ہے گویا

دکھ جی کو پسند ہوگیا ہے غالب
دل رک کر، بند ہوگیا ہے غالب
واللہ کہ شب کو نیند آئی ہی نہیں
سونا سوگند ہوگیا ہے غالب

بعد از اتمام بزم عید اطفال
ایام جوانی رہے ساغر کش حال

آپہونچے ہیں تا سواد اقلیم عدم
ہے عمر گشتہ ایک قدم استقبال

ظفر شاہ کی برسی کے موقع پر ذیل کی دو رباعیاں کہی ہیں۔

حق شہ کی بقا سے خلق کو شاد کرے تاشاہ شیوخ دانش و داد کرے
یہ دی جو گئی ہے رشتہ عمر میں گانٹھ ہے صفر کہ افزائش اعداد کرے

اس رشتہ میں لاکھ تار ہوں بلکہ سوا
اتنے ہی برس شمار ہوں بلکہ سوا
ہر سیکڑے کو ایک گرہ فرض کریں
ایسی گرہیں ہزار ہوں بلکہ سوا

ایک موقع پر ظفر شاہ نے غالب کو سیم کے بیج روانہ کئے تو غالب نے شکریہ کے طور پر ایک رباعی کہی ہے۔

ان سیم کے بیجوں کو کوئی کیا جانے
بھیجے ہیں جو ارمغاں شہ والا نے
گن کر دیوں گے ہم دعائیں سو بار
فیروزے کی تسبیح کے ہیں یہ دانے

مرزا غالب نے رباعی کو کہیں زیادہ نہیں برتا؟ یہ سوال اسی طرح ہے کہ انہوں نے غزل کو کیوں زیادہ برتا؟ انہیں دو سوالوں میں جواب موجود ہیں۔ شاعر جس صنف سے زیادہ قریب ہوتا ہے اسی کو زیادہ برتتا ہے اور غالب کی زندگی نثر نویسی اور غزل گوئی میں بیت گئی ہے۔ بے چاری رباعی کو ان کی زندگی کے صرف چند لمحات ہی ملے ہوں گے۔

✿✿✿

غالب کے پہلے سوانح نگار
خواجہ الطاف حسین حالیؔ پر سیمینار

غالب اکیڈمی قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے اشتراک سے غالب کے پہلے سوانح نگار الطاف حسین حالیؔ پر بروز اتوار 19رجنوری 2014 کو ایک کل ہند سیمینار کا اہتمام کرے گا۔ جس میں خواجہ الطاف حسین حالیؔ کے مختلف پہلوؤں پر دہلی اور بیرون دہلی کے اسکالر مقالات پیش کریں گے۔

متوقع اسکالرز کے اسمائے گرامی درج ذیل ہیں:

جناب ایس وائی قریشی، پروفیسر شمیم حنفی، پروفیسر قاضی افضال حسین، پروفیسر قاضی جمال حسین، پروفیسر نصیر احمد خاں، پروفیسر عبد الحق، پروفیسر وہاب قیصر، پروفیسر شریف حسن قاسمی، پروفیسر وہاج الدین علوی، ڈاکٹر ضیاء الرحمٰن صدیقی، پروفیسر انور پاشا، ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین، پروفیسر سلیل مسرا، پروفیسر مظہر مہدی۔

غالب اکیڈمی کے یوم تاسیس اور مرزا غالب کے یوم ولادت کے موقع پر سہ روزہ پروگرام

21رفروری 2014 کو محفل کلام غالب

22فروری 2014 کو طرحی مشاعرہ

23رفروری 2014 کو کل ہند سیمینار ''غالب اور غالب کی دلی''

✡✡✡

ڈاکٹر جاویدہ حبیب

غالب کا ہم عصر شاعر ''لطیف آرکاٹی''

جنوب کے اکبر وادب میں اگر لطیف آرکاٹی کا قد متعین کیا جائے تو ان کو ادب کے معماروں میں صف اول میں ضرور شامل کیا جا سکتا ہے۔ آپ نے اس زریں دور میں اپنی سانسیں لی تھیں۔ جس میں نواب غلام غوث خاں اعظم جیسی شخصیت علم و ادب کی پرورش میں بہت اہم رول ادا کر رہی تھی۔ نواب غلام غوث خان اعظم کے دور کو جنوب میں اردو غزل کے ارتقا کا درو کیا جائے تو اس میں کوئی مبالغہ نہیں۔ آپ کا نام عبد الطیف قادری چشتی اور تخلص لطیف آرکاٹی تھا۔

لطیف آرکاٹی کی ابتدائی زندگی اور پرورش و پرداخت کی تفصیلات پر زمانے تک پردہ پڑا ہوا تھا۔ ایک مدت کے بعد ان کی زندگی کے کچھ پہلو روشن ہوئے ہیں۔

جناب احمد اللہ خاں مرحوم مدیر جمہور نے اپنے ایک مضمون ''میسور کا ایک نامور شاعر، لطیف آرکاٹی، میں لطیف کا سنہ پیدائش 1178ھ مطابق 1764ء تحریر کیا ہے اور تاریخ وفات 1689ھ مطابق 1876ء بتائی ہے۔☆-1- تاریخ وفات کے متعلق آگے چل کر لکھا ہے کہ اس کی تصدیق مولانا عبدالرحمٰن شاطر مدراسی اور ان کے برادر محمد منور خاں بہادر گوہر مدراسی نے بھی کی ہے۔ لیکن سنہ پیدائش کے متعلق خود اعتراف کیا ہے کہ وہ قیاساً ہے۔ جناب علیم صبا نویدی نے اپنے مضمون ''غالب کا ایک ہم عصر شاعر'' میں لطیف کی مذکورہ تاریخ وفات کے متعلق کچھ نہیں کہا لیکن سنہ پیدائش کے متعلق صاف طور پر کہا ہے کہ'' تا حال تلاش و تحقیق کے باوجود صحیح پیدائش کا پتہ نہیں چلتا۔☆-2- لطیف آرکاٹی نے تقریباً 112 (ایک سو بارہ) سال کی بڑی طویل حیات پائی تھی۔

لطیف آرکاٹی نے بعض نامعلوم وجوہات کی بنا پر اپنا وطن شرزہ پور ترک کر دیا تھا۔ یہ بات بھی نہیں معلوم ہوسکی کہ انہوں کب ترک وطن کیا تھا۔ البتہ مؤلف ''بقائے دوام'' سید احمد صاحب ایڈوکیٹ (بنگلور) نے لطیف آرکاٹی کا تعارفی خاکہ پیش کرتے ہوئے یہ انکشاف کیا ہے کہ ''حافظ محمد خان جو شرزہ پور کے جاگیردار اور نواب تھے اور لطیف کے مربی اور محسن بھی تھے، کے انتقال (1206ھ بہ مطابق 1790ء) کے بعد لطیف نے اپنا وطن ہمیشہ کے لئے چھوڑ کر آرکاٹ کا رخ کیا۔ ☆۔3۔ فاضل مضمون نگار نے اس قطعہ سے فائدہ اٹھایا ہے جسے لطیف آرکاٹی نے تحریر کیا ہے ۔

اسم اس فیاض عالم کا یہی معروف تھا	حضرتِ حافظ محمد خان جو یہ مشہور ہے
یک ہزار و دو صد شش سال کی ہجری میں وہ	راہی جنت ہوا، سجدے میں سو مذکور ہے
جا زیارت کو تو اس فیاض عالم کی لطیف	مرقد عالی پہ جس کے حق کا دائم نور ہے

اور یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ حضرت حافظ محمد خان کی وفات کے وقت لطیف آرکاٹی شرزہ پور سے ہجرت کر چکے تھے۔ ان کا یہ مصرعے اسی قیاس کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔

''راہی جنت ہوا سجدے میں سو مذکور ہے

اور جا زیارت کو تو اس فیاض عالم کی تصنیف''

''مذکور'' اور ''جا زیارت کو'' سے اس قیاس کو تائید ملتی ہے۔

علیم صبا نویدی کا خیال ہے کہ لطیف کے وطن چھوڑ دینے کا پس منظر اہل وطن کے درمیان ان کی ناقدری ہے۔ ☆۔4۔ یہ نتیجہ انھوں نے لطیف کے کلام کی اندورنی شہادتوں سے اخذ کیا ہے۔

کب تک پڑا رہے گا تو اپنے وطن کے بیچ	عزت نہیں ہے گل کو مقامِ چمن کے بیچ
مانندِ گل چمن سے جب تک نہ ہو جدا	اہل ہنر کی قدر نہیں ہے وطن کے بیچ

ان اشعار سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ لطیف کی پرسشی و پذیرائی ان کے وطن میں خاطر خواہ نہیں ہوئی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ وطن چھوڑ دینے کی ایک وجہ ان کے برادر کلاں سے چشمک بھی تھی۔ بڑے بھائی اور دیگر رشتہ داروں سے بچھڑ کر لطیف آرکاٹی کچھ خوش بھی نہیں تھے۔ احمد اللہ خان مدیر

جمہور بنگلور کے قول کے مطابق اس کا اثر ان کے دل و دماغ پر بھی ہوا تھا اور سولہ سال کی عمر ہی میں بہت صدمے اٹھائے اور زمانے کے دکھ جھیلے۔☆۔5۔

بقول علیم صبا نویدی ''لطیف آرکاٹی'' نے یہ ہجرت اپنی بیش سال کی عمر میں کی تھی۔شہادتِ ٹیپو سلطان 1213ھ سے پہلے وہ آرکاٹ آئے تھے اور یہیں انہوں نے شادی بھی کی اور ان کی اولاد بھی ہوئی تھی۔ افسوس کہ ان کی خانگی زندگی کچھ خوشگوار ثابت نہ ہوئی۔ بیوی ستم ظریف اور اولاد ناخلف ٹھہری۔جس کا ذکر لطیف نے اپنے کلام میں بھی کیا ہے۔☆۔6۔

جو ترے بندے ہیں صالح پاک باطن اے لطیف　　عصمت و غیرت کے ان کو پارسا عورت دے

عورتِ نیک سے ہے مرد کو آرام لطیفؔ　　نہ ہو، ایسا تو جئے لگ ہے وہ جوڑا گھوڑا

عجب کام قسمت کا گولہ ہوا　　میں پیرا تھا خرما سندولہ ہوا

(بمعنی بونا)

تخم لیمو جہاں ہوتا ہوں تو ہوتا ہے نیم　　ایسے تخمِ بد کے یاں ہونے سے نہ ہونا بھلا

نوحؑ کا بیٹا بھی ہو تو صاف کہہ دینا لطیفؔ　　ناخلف اولاد کے ہونے سے نہ ہونا بھلا

مگر لطیفؔ کے حسی طبیعت پر اس غم و اندوہ نے سیقل کا کام کیا اور اسے جلا بخشی اور ان کی شاعری میں حسی کیفیات اور جو درد و اندوہ کی آمیزش ہوئی ہے وہ بڑی موثر ثابت ہوئی ہے، لطیف آرکاٹی نے اس کا اقرار کیا۔

کب رسائی تھی شعر کو میرے　　یہ میری آہ کی رسائی ہے

لطیف آرکاٹی کو نہ صرف اپنے بڑے بھائی رشتہ داروں اور بیوی بچوں سے ناآسودگی ملی بلکہ اہل دنیا کے مراسم سے بھی وہ دل برداشتہ سے دکھائی دیتے ہیں۔☆۔7۔

امید قومِ بد سے ہرگز کبھی نہ دیکھئے　　جنگ میں وفا کسی سے کرتے ہیں کب کمینہ

آئینہ رو کو ہرگز دل صاف تم نہ سمجھو　　مانندِ تیغ کے یہ رکھتے ہیں رنگ کمینہ

منہ اوپر صاف ہے جو دل سے منافق ہے لطیفؔ　　ایسے کم ظرف کو تم دل میں کبھی مت جادو

لطیف آرکاٹی نجیب الطرفین ہیں اور اس پر شاکر دکھائی دیتے ہیں۔ کہتے ہیں:

کم تر ہوں بندگانِ الٰہی سے اے لطیف　　طرفین سے اگرچہ نسب میں شریف ہوں

اور یہ بھی عرض کیا ہے۔

سادات کی ہے قدر اس حق شناس کو　　جس کو خدا رسولؐ کا ہے پاس و امتیاز

شریف ہونے کے وصف کے لئے انہوں نے یہ شرائط بیان کی ہیں۔

صاحب وہی، شریف وہی، نامور وہی　　جگ میں کیا جو زندگیِ شرم وحیا کے ساتھ

مولانا ابوالجلال ندوی کی تحقیقی کاوشوں سے یہ انکشاف ہوا ہے کہ لطیف آرکاٹ کو ترک کر کے مدراس کی طرف رجوع کیا تھا۔☆۔8۔

اس وقت ''دربار اعظم'' بڑے آب و تاب سے آراستہ تھا۔ نواب غلام غوث خان اعظم نے لطیف آرکاٹی کی بڑی قدر و منزلت کی اور اپنے مصاحبوں اور ہمنواؤں میں ان کو شمار کیا۔ یہاں آ کر لطیف کو پہلی مرتبہ آسودگی ملی اور زندگی میں ٹھہراؤ حاصل ہوا اور لطیف آرکاٹی نواب غلام غوث خان اعظم کی اعانت سے گنج سوائی حضرت قادر ولی ناگوری اور ہند الولی خواجہ معین الدین چشتیؒ غریب نواز اجمیری کی بارگاہوں کی زیارت کی اور حج بیت اللہ سے بھی مشرف ہوئے۔ ان مذکورہ مقدس مقامات میں لطیف آرکاٹی نے اپنے محسن کے لیے دلی دعائیں کی ہیں۔☆۔9۔

نواب غوث خاں کے لیے عرض ہے یہی　　مانندِ خضر عمر ہو اس کی دراز وطول

کعبہ میں پہنچ کر یہ دعا مانگے لطیف　　یارب ہمارے شاہ کی نت عمر ہو دراز

کمی کس بات کی ہرگز نہ ہوگی　　کسی سید کی اس گھر جو دعا ہے

لطیف آرکاٹی کی طبیعت میں باطنی صفائی حاصل کرنے کی طرف بھی میلان تھا اور انہوں مولانا سید شہاب الدین کے دست مبارک پر بیعت کر لی تھی۔ پروفیسر میر محمود حسین اپنے مضمون 'ویلورنامہ'' میں رقم طراز ہیں کہ مولانا ایک زمانہ تک ویلور میں سکونت پذیر تھے اور وہ اپنی آخری عمر میں میسور آئے اور یہیں انہوں نے داعی اجل کو لبیک کہا۔☆۔10۔

جناب اکرم کاوش مؤلف ''داستان میسور'' رقم طراز ہیں کہ مولانا مدرسۂ لطیفیہ ویلور کے فارغ التحصیل تھے اور اپنی آخری عمر میں سری رنگ پٹن آئے اور وہیں اپنے آبائی مکان بنام'' قادر اولیا مکان'' میں رہتے تھے۔ مولانا اپنی آخری سانس تک سلوک و معرفت کی تعلیم دینے میں مصروف رہے۔☆۔11۔

بقول راہی فدائی، مولانا شہاب الدین ویلوری، حضرت قبلہ قطب ویلور کے خلیفہ بھی تھے۔ ☆۔12۔لطیف آرکاٹی کی زندگی میں یہ تبدیلی شاعری میں بھی اپنا اثر دکھانے لگی تھی۔ وہ اپنے پیر و مرشد کی عظمت میں کہتے ہیں۔

اے شہاب اوج عزت، واقفِ اسرار دیں ہمچو نور صبحِ روشن، کاشف علم یقین

اور اپنے پیر و مرشد سے اس واسطے کی بقا پر یوں کہتے ہیں:

یا الٰہی تابہ دور مہر و ماہ تابندہ دار
فیض مولانا شہاب الدین پہ روئے زمین

لطیف آرکاٹی نے اپنے اشعار میں کہیں کہیں سودا، میر، جرأت، یقین اور انشاء کا ذکر کیا ہے۔

حضرتِ میردرد سے زاید،
دور بیں میں دماغ رکھتا ہوں
سودا سے میردرد سے، جرأت یقین سے
انشاء سے اور تقی سے عقیدت مدام ہے
(میر تقی میر)

لطیف آرکاٹی کے بعض شعر واقعی اپنی ایمائیت اور پر گوئی کی مثال ہیں:

مشرب تو عاشقی کا بہت سخت ہے لطیف ہر بوالہوس سے سمجھ کو نبھایا نہ جائے گا
(سچ)

دنیا میں سوز و درد کسی کا کسے نہیں دیکھوں تو جس کو اپنی ہی مطلب کا آشنا

(کسی کو)

بھول مت آبادی دنیا پہ اے مرد جہاں کام ہے درپیش آخر سب کو ویرانے کے ساتھ

ناحق جو ہم خراب ہوئے دلربا کے ساتھ اے کاش دل لگاتے ہم اپنے خدا کے ساتھ

گنہ جو کر چکے پھر مت کرو ہوا سو ہوا کرم تو حق ہے، غضب سے ڈرو ہوا سو ہوا

لطیف آرکاٹی کا مجموعہ ''دیوان لطیف'' ان کی وفات کے برسوں بعد، کتاب گھر، میل وشارم (شمالی آرکاٹ) سے شائع ہوا۔

حواشی:

1۔ ماہنامہ ''مخزن'' شمارہ نمبر 8۔ مطبوعہ 1959ء

2۔ جنوب کا شعروادب از: علیم صبا نویدی، ص:53۔ مطبوعہ جون 1993ء

3۔ مضمون ''میسور کا ایک نامور شاعر'' مخزن شمارہ نمبر 8 مطبوعہ 1952ء

4۔ جنوب کا شعروادب، علیم صبا نویدی، مطبوعہ 1992 ص، 54

5۔ ماہنامہ ''مخزن'' شمارہ نمبر 8، مطبوعہ 1959

6۔ جنوب کا شعروادب، علیم صبا نویدی، مطبوعہ 1992 ص، 57

7۔ ایضاً

8۔ ایضاً

9۔ جنوب کا شعروادب، علیم صبا نویدی، مطبوعہ 1992 ص، 58

10۔ مضمون ''ویلورنامہ'' پروفیسر میر محمد حسن، مطبوعہ ''نقیر'' ویلور، بحوالہ ''جنوب کا شعروادب، ص، 58''

11۔ اکرام کاوش ''داستان میسور'' مطبوعہ 1989ء بحوالہ ''جنوب کا شعروادب، ص، 58''

12۔ بحوالہ ''جنوب کا شعروادب'' علیم صبا نویدی، مطبوعہ 1993ء، ص، 54''

✿✿✿

بشریٰ بیگم

غالب کی برجستہ گوئی

برجستہ کے لغوی معنی بے ساختہ، خود بخود، سادہ اور قدرتی کے ہیں۔ برجستہ پن یا برجستہ گوئی ایک صفت ہے جو اکثر لوگوں میں قدرتی طور پر ہوتی ہے۔ یا برجستہ گوئی اللہ تعالیٰ کا ایک ایسا عطیہ ہے جو ہر کسی کو نہیں ملتا۔ برجستہ گوئی حاضر دماغی کا ایک شعبہ ہے۔ جو برجستہ گو ہے اس کا حاضر دماغ ہونا لازمی ہے۔ لیکن ہر حاضر دماغ کے لیے ضروری نہیں کہ وہ برجستہ گو بھی ہو۔ اکثر سنجیدہ اور خاموش مزاج والے لوگوں میں عموماً برجستہ گوئی نہیں پائی جاتی۔ اس کے علاوہ بڑے بڑے عالم فضل اور فلسفی لوگوں میں برجستہ گوئی کم پائی جاتی ہے۔ برجستہ گوئی کے معنی یہ نہیں ہیں کہ انسان گالی کا جواب گالی سے دے، برجستہ تو یہ ہے کہ بات میں بے ساختگی کے ساتھ لطف پیدا ہو جائے اور سننے والے محظوظ ہوں۔ شگفتہ مزاجی اور برجستہ گوئی دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم ہیں۔ جو انسان برجستہ گو ہوتا ہے وہ شگفتہ مزاج بھی ہوتا ہے۔ اگر اردو ادب کی طرف نظر ڈالیں تو ایسے کئی شاعر اور ادیب ہیں جو شگفتہ مزاجی کے ساتھ برجستہ گو بھی ہیں۔ ان کی اسی برجستہ گوئی نے ان کو الگ پہچان دی۔ ایسے برجستہ گو شعرا میں مرزا اسد اللہ خاں غالب کا نام اول نمبر پر آتا ہے

مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ کا نام اردو زبان کے نامور شعرا میں لیا جاتا ہے۔ یہ ایک ایسی شخصیت ہیں جنھیں آج بھی اردو زبان وادب کا بلند پایہ شاعر، مایہ ناز نثر نگار مانا جاتا ہے، رجحان ایسا بنا ہوا ہے کہ جب بھی اردو شاعری کا ذکر چلتا ہے تو سب سے پہلے مرزا غالبؔ کا نام زبان پر آتا ہے، اردو ادب میں مکتوب نگاری کا ذکر ہو تو غالبؔ کے خطوط صفحہ اول پر آتے ہیں، شگفتگی وشوخیوں کی بات چلے تو مرزا کے لطیفے پہلے یاد آتے ہیں۔ یہ ایسی شخصیت تھے جن کی زندگی کا ہر

پہلو ادب کی میراث بن گیا ہے۔ غالبؔ کی شاعری کی عظمت کے پس پردہ ان کی زندگی کا المیہ ان کے لیے تاعمر ایک ناسور رہا، جس کا وہ اپنی ظرافت اور بذلہ سنجی سے ہمیشہ مقابلہ کرتے رہے۔ غالبؔ کی زندگی پر لکھی گئی کتابوں کا مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ ان کی زندگی ایک المیہ تھی۔ لیکن وہ اپنی زندگی کے اطراف میں بکھرے دکھ، تکلیف، پریشانیوں کا مقابلہ خوش اسلوبی و خوش بیانی سے کرتے نظر آتے ہیں۔ ان کی اس خوش بیانی و برجستہ گوئی نے اردو ادب میں نثر کو طنز و مزاح و لطائف سے نوازا ہے، جس کو پڑھ کر شائقین محظوظ ہوئے بنا نہیں رہ پاتے۔ آج بھی ان کی برجستہ گوئی کو لوگ ضرب المثل کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ جیسے کہیں آموں کی پسند اور ناپسند کا ذکر چلتا ہے تو کہیں شراب نوشی تو کہیں روزے کا ذکر چلتا ہے۔ درج ذیل چند واقعات سے غالب کی برجستگی و خوش بیانی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

ایک روز مرزا کے دوست حکیم رضی الدین خاں صاحب جن کو آم مرغوب نہیں تھے مرزا کے مکان پر آئے دونوں دوست برآمدے میں بیٹھ کر باتیں کرنے لگے اتفاق سے ایک گدھے والا اپنے گدھے لیے ہوئے سامنے سے گزرا زمین پر آم کے چھلکے پڑے تھے ایک گدھے نے سونگھا اور چھوڑ کر آگے بڑھ گیا حکیم صاحب نے جھٹ مرزا صاحب سے کہا دیکھئے آم ایسی چیز ہے جسے گدھا بھی نہیں کھاتا مرزا صاحب فوراً بولے ''بیشک گدھا آم نہیں کھاتا۔''

☺☺☺

ایک دفعہ جب رمضان گزر چکا تو غالب قلعہ میں گئے، بادشاہ نے پوچھا، مرزا تم نے کتنے روزے رکھے؟ عرض کیا ''پیر و مرشد ایک نہیں رکھا۔''

☺☺☺

ایک صحبت میں مرزا، میر تقی میر کی تعریف کررہے تھے۔ شیخ ابراہیم ذوق بھی موجود تھے، انھوں نے سودا کو میر پر ترجیح دی۔ مرزا نے کہا میں تم کو میری سمجھتا تھا، مگر اب معلوم ہوا کہ آپ سودائی ہیں۔

☺☺☺
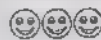
مکان کے جس کمرہ میں مرزا دن بھر بیٹھتے تھے وہ مکان کے دروازے کی چھت پر تھا اور اس کے

ایک جانب ایک کوٹھری، تنگ و تاریک تھی جس کا دراس قدر چھوٹا تھا کہ کوٹھری میں بہت جھک کر جانا پڑتا تھا۔اس میں ہمیشہ فرش بچھا رہتا تھا اور مرزا اکثر گرمی اور لو کے موسم میں دس بجے سے تین چار بجے تک وہاں بیٹھتے تھے ۔ایک دن جبکہ رمضان کا مہینہ اور گرمی کا موسم تھا۔مولانا آزردہ ٹھیک دوپہر کے وقت مرزا سے ملنے چلے آئے۔اس وقت مرزا صاحب اسی کوٹھری میں کسی دوست کے ساتھ چوسر یا شطرنج کھیل رہے تھے،مولانا بھی وہیں پہنچے اور مرزا کو رمضان کے مہینے میں چوسر کھیلتے ہوئے دیکھ کر کہنے لگے۔ہم نے حدیث میں پڑھا ہے کہ رمضان کے مہینے میں شیطان مقید رہتا ہے۔مگر آج اس حدیث کی صحت میں تردد ہو گیا۔مرزا نے کہا،"قبلہ حدیث بالکل صحیح ہے۔مگر آپ کو معلوم رہے کہ وہ جگہ جہاں شیطان مقید ہے یہی کوٹھری تو ہے۔"

😊😊😊

ایک دن دیوان فضل اللہ خاں مرحوم چرٹ میں سوار مرزا کے مکان کے پاس سے بغیر ملے نکل گئے ۔مرزا کو معلوم ہوا تو انھوں نے ایک رقعہ دیوان جی کو لکھا یہ مضمون کہ آج مجھ کو اس قدر ندامت ہوئی ہے کہ شرم کے مارے زمین میں گڑا جاتا ہوں اس سے زیادہ کیا نالائق ہو سکتی ہے کہ آپ کبھی نہ کبھی اس طرف سے گزریں اور میں سلام کو حاضر نہ ہوں۔

جب یہ رقعہ دیوان جی کے پاس پہنچا تو وہ بہت شرمندہ ہوئے اور اسی وقت گاڑی میں سوار ہو کر مرزا صاحب سے ملنے آئے۔

😊😊😊

ایک روز دوپہر کا کھانا آیا اور دسترخوان بچھا برتن تو بہت سے تھے مگر کھانا بہت قلیل تھا مرزا نے مسکرا کر کہا اگر برتنوں کی کثرت پر خیال کیجیے تو میرا دسترخوان یزید کا دسترخوان معلوم ہوتا ہے اور جو کھانے کی مقدار کو دیکھئے تو بایزید کا۔

😊😊😊
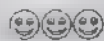
ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ کسی صاحب نے مرزا غالب کے سامنے شراب کی بے انتہا مذمت کی۔مرزا صاحب دل ہی دل میں پیچ و تاب کھاتے رہے اور جب نہ رہا گیا تو ان صاحب سے پوچھا

کہ: آخر شراب میں کیا برائی ہے؟

وہ صاحب بولے۔

حضرت، پہلی برائی تو یہی ہے کہ شرابی کی دعا قبول نہیں ہوتی۔

یہ سن کر مرزا صاحب نے ان سے کہا کہ:

ذرا یہ تو بتائیے کہ جس کے پاس شراب موجود ہے پھر اس کم بخت کو اور کون سی دعا کی ضرورت ہے۔

☺☺☺

ایک مرتبہ جاڑے کے زمانے میں نواب مصطفے خاں شیفتہ، مرزا غالب کے مکان پر ان سے ملنے کے لیے آ نکلے۔ مرزا غالب شغل مے میں لگے ہوئے تھے۔ نواب صاحب کو دیکھ کر ان کی طرف مرزا صاحب نے شراب کا گلاس بڑھا دیا، اور کہا:

لیجیے نا۔۔۔

نواب شیفتہ خاموشی سے دیکھتے رہے۔

مرزا صاحب نے پھر خود ہی سکوت توڑتے ہوئے کہا:

کیا حضرت جاڑے میں بھی نہیں پیتے؟

☺☺☺

شام کو اکثر مرزا غالب کے خاص خاص شاگرد اور بے تکلف دوست جمع ہو کر ان کے پاس بیٹھا کرتے تھے۔ مرزا سرور و کیف کے عالم میں بڑی پر لطف اور دل چسپ باتیں کیا کرتے تھے۔ ایک دن اسی طرح مرزا صاحب پلنگ پر دراز تھے کہ اتنے میں میر مہدی مجروح آ گئے اور بہ کمال محبت مرزا کے پاؤں دابنے لگے۔۔۔۔ مرزا صاحب نے لاکھ کہا کہ: ارے تو سید زادہ ہو کر پاؤں دباتا ہے مجھے کیوں کر گناہ گار کرتا ہے؟ مگر جوش عقیدت اور خلوص کی فراوانی اتنی تھی کہ یہ کون سنتا ہے میر مہدی مجروح برابر پاؤں دابتے رہے جب مرزا صاحب نے بہت زور دے کر منع کیا تو میر مہدی مجروح بولے۔

اگر آپ کو ایسا خیال ہے تو پاؤں دابنے کی اجرت دے دیجیے گا۔

مرزا صاحب نے فرمایا۔

خیر یہاں تک کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

جب میر مہدی پاؤں داب چکے تو بولے۔ لائیے حضرت میری اجرت دلائیے۔

مرزا صاحب نے کہا۔

واہ بھئی واہ۔ اماں اجرت کیسی؟ تم نے میرے پاؤں دابے میں نے تمہاری اجرت دابی دونوں برابر ہو گئے۔

☺☺☺
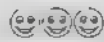
مرزا غالب کو بھی غدر کے ہنگامے کے بعد جب پکڑ دھکڑی شروع ہوئی تو بلایا گیا۔۔ یہ کرنل براؤن کے روبرو پیش ہوئے تو وہی کلاہ پپاخ جو یہ پہنا کرتے تھے حسب معمول ان کے سر پر تھی جس کی وجہ سے کچھ عجیب وغریب وضع قطع معلوم ہوتی تھی۔ انہیں دیکھ کر کرنل براؤن نے کہا:

ول مرزا صاحب تم مسلمان ہے؟

مرزا صاحب نے نہایت متانت سے جواب دیا:

آدھا مسلمان ہوں۔

کرنل براؤن نے کہا۔

آدھا مسلمان کیا؟ اس کا مطلب؟

مرزا صاحب بولے۔

آدھا یوں کہ شراب پیتا ہوں، سور نہیں کھاتا۔

یہ سن کر کرنل براؤن بہت محظوظ ہوا اور مرزا صاحب کو اعزاز کے ساتھ رخصت کیا۔

☺☺☺
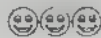
جب نواب یوسف علی خاں والی رام پور کا انتقال ہو گیا تو مرزا غالب بھی بسلسلہ تعزیت رام پور تشریف لے گئے۔ نواب یوسف علی خاں کے بعد نواب کلب علی خاں مسند نشین ہوئے۔۔ اتفاقاً ایک دن نواب کلب علی خاں صاحب لفٹنٹ گورنر سے ملنے کے لئے بریلی جا رہے تھے روانگی کے

وقت جہاں اور بہت سے لوگ تھے، مرزا غالب بھی موجود تھے۔

مرزا غالب سے ہوتے رخصت ہوئے رسماً نواب کلب علی خاں صاحب نے کہا۔

اچھا مرزا صاحب، خدا کو سونپا۔

مرزا صاحب نے کہا:

حضور غضب ہے۔۔

نواب صاحب نے پوچھا۔ کیوں...؟

خدا نے تو مجھے آپ کے سپرد کیا تھا آپ پھر خدا کے سپرد کیے دیتے ہیں۔ مرزا صاحب نے بڑی متانت سے کہا۔

☺☺☺

جب مرزا غالب نے قاطع برہان لکھی تو مخالفین کا ایک سیلاب اُمڈ آیا۔ ہر طرف سے جواب لکھے گئے ان ہی جواب لکھنے والوں میں سے ایک صاحب امین الدین نامی بھی تھے جنہوں نے قاطع برہان کے جواب میں قاطع قاطع لکھی تھی، چوں کہ قاطع قاطع کی بنا صرف بدگوئی اور فحش گوئی پر رکھی گئی تھی لہذا مرزا صاحب نے اس کا کوئی جواب بھی نہ دیا اور خاموش بیٹھے رہے۔۔۔ مرزا صاحب کے ہم نواؤں میں سے کسی نے کہا۔

مرزا صاحب آپ نے کوئی جواب نہیں دیا...؟

مرزا صاحب نے فرمایا کہ۔

حضرت اگر کوئی گدھا آپ کے لات مار دے تو آپ کیا جواب دیں گے۔۔

☺☺☺

ایک روز شام کے وقت کہ سورج غروب ہونے کو تھا مرزا صاحب کا کھانا گھر سے آیا۔ کھانے میں صرف شامی کباب تھے۔ مرزا صاحب نے کھانا شروع کردیا۔ اتفاق سے اس وقت مولانا حالی بھی بیٹھے تھے انھوں نے رومال نکال کر مکھیاں اڑانا شروع کردی مرزا صاحب نے انھیں مخاطب کر کے کہا۔ ”بھیا تم بے کار تکلیف کرتے ہو میں ان کبابوں میں سے تمہیں کچھ بھی نہ دوں گا۔“

مولانا ہنس پڑے پھر مرزا صاحب نے ایک لطیفہ سنایا کہ نواب عبدالاحد خاں کے دسترخوان پر ان کے مصاحبوں عزیزوں اور دوستوں کے لیے ہر قسم کے کھانے چنے جاتے تھے۔مگر صرف نواب صاحب کے لیے ہمیشہ ایک خاص چیز تیار ہوتی تھی وہ صرف اسی کو کھاتے اور دوسرے کھانوں کی طرف توجہ نہ کرتے تھے۔ ایک دن کا ذکر ہے کہ ان کے لیے مزعفر پکا تھا اور وہی ان کے سامنے لگایا گیا۔ مصاحبوں میں ایک ڈوم نواب کا بہت منہ چڑھا تھا۔نواب صاحب نے اس کو کھانا دینے کے لئے خالی پلیٹ مانگی۔ پلیٹ کے آنے میں دیر ہوئی۔نواب صاحب کھانا کھاتے جا رہے تھے اور خالی پلیٹ بھی برابر مانگے جا رہے تھے۔ وہ ڈوم نواب صاحب کے سامنے رومال ہلانے لگا اور بولا۔۔۔ حضور اب دوسری پلیٹ منگانے کی کیا ضرورت ہے۔اب یہی خالی ہوئی جاتی ہے۔۔۔ یہ سن کر نواب ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو گئے اور اپنی پلیٹ اس کی طرف سرکا دی۔

😂😂😂

سید سردار مرزا جو مرزا غالب کے اچھے دوستوں میں تھے ایک بار مرزا صاحب سے ملنے آئے۔ شام کا وقت تھا۔تھوڑی دیر بیٹھے پھر اٹھ کر جانے لگے تو مرزا صاحب نے شمع دان لیا اور کھسکتے کھسکتے فرش کے کنارے تک آئے تا کہ روشنی میں جوتا دیکھ کر پہنیں۔سردار مرزا نے کہا۔حضرت قبلہ آپ نے کیوں زحمت کی میں خود اپنا جوتا پہن لیتا۔

اس پر مرزا صاحب نے انہیں جواب دیا۔

حضرت میں آپ کا جوتا دکھانے کے لیے شمع دان لے کر نہیں آیا ہوں بلکہ اپنا جوتا دکھانے کے لیے آیا ہوں کہ وہ محفوظ رہنا چاہیئے کہیں آپ اس کو نہ پہن جائیں۔

😂😂😂

مرزا غالب ایک بار اپنا مکان بدلنا چاہتے تھے چنانچہ اس سلسلے میں کئی مکانات دیکھے جن میں سے ایک کا دیوان خانہ مرزا صاحب کو پسند آیا مگر محل سرا دیکھنے کا موقع نہ مل سکا۔گھر آ کر بیگم صاحب کو اس مکان کی محل سرا دیکھنے کے لیے بھیجا۔جب وہ دیکھ کر آئیں تو مرزا صاحب نے پوچھا تو بیگم صاحبہ نے بتایا:

اس مکان میں لوگ بلا بتاتے ہیں۔۔

مرزا صاحب یہ سن کر بہت ہنسے اور ہنس کر کہا۔

کیا آپ سے زیادہ بھی کوئی اور بلا ہے۔۔۔

☺☺☺

ایک بار مرزا صاحب گھر میں جانے لگے تو دیکھا کہ بیگم صاحبہ بین صحن میں مصلیٰ بچھائے ہوئے نماز پڑھ رہی ہیں مرزا صاحب یہ دیکھ کر دروازے پر ہی ٹھہر گئے جب وہ نماز پڑھ چکیں تو اپنا جوتا اتار کر سر پر رکھا اور ننگے پاں ہچکچاتے ڈرتے آہستہ آہستہ صحن تک آئے بیگم صاحبہ نے یہ حالت دیکھ کر متعجب ہو کر پوچھا۔ یہ کیا....؟

مرزا صاحب نے جواب دیا کہ۔

کچھ نہیں !آپ کے مصلیٰ کی تعظیم وتکریم منظور ہے۔

بیگم صاحبہ نے وضاحت چاہی تو مرزا صاحب نے فرمایا:

جب تمام صحن تو مسجد ہو گیا تو پھر اگر کوئی قدم رکھے تو کہاں رکھے اور کرے تو کیا کرے۔اس لئے جوتے اتار سر پر رکھ لئے۔

☺☺☺

ایک مرتبہ مغفرت کا کچھ ذکر چلا تو مرزا صاحب کی بیگم نے فرمایا:

آپ تو کبھی نماز بھی نہیں پڑھتے روزہ تو خیر بڑی چیر ہے۔۔

مرزا صاحب نے جواب دیا۔

خیر یہ تو ٹھیک ہے مگر تم سے ہمارا حشر اچھا ہوگا۔

بیگم نے کہا۔یہ کیوں۔۔۔

اس پر مرزا صاحب نے فرمایا کہ۔

آپ تو ان ہی نیلے تہمد والوں کے ساتھ ہوں گی جن کے تہمد کے پلے میں مسواک بندھی ہوگی، سر منڈے ہوئے ہوں گے اور ہمارا حشر بڑے بڑے جلیل القدر عالی نسب بادشاہوں کے ساتھ ہوگا جیسے فرعون، نمرود، شداد اور ہم موچھیں چڑھاتے اکڑتے ہوئے چلے جا رہے ہوں گے چار

فرشتے ادھر جلو میں ہوں گے، چار ادھر۔

☺☺☺

مرزا صاحب کے ایک عاشق مزاج دوست جو پہلے کسی کے حلقہ گیسو کے اسیر تھے اور اب تائب ہو کر حج بیت اللہ کو جارہے تھے تو مرزا صاحب سے بھی ملنے آئے اور بتایا کہ:

سفر حج کو جارہا ہوں۔

مرزا صاحب نے ہنس کر کہا۔

غرض کوچہ گردی کی عادت نہ گئی اور دشت پیمائی کا لپکا نہ چھٹا۔ جب یوں مارے مارے پھرتے تھے۔اب یوں پھرو گے۔

☺☺☺

ایک بار مرزا صاحب کسی کتب فروش کی دوکان پر بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک ایرانی نوجوان آیا اور دوکان دار سے دریافت کیا کہ:

دیوان غالب داری۔۔

دوکان دار نے جواب دیا۔

دیوان غالب نہ دارم۔ دیوان ظہوری دارم، دیوان نظیری دارم۔

ایرانی نوجوان نے پھر کہا۔

نے نے ایں ہمہ مطلوب نیست۔ دیوان غالب داری۔۔۔ایں قرم ساق خوب می گوید۔۔۔

یہ سن کر دوکان دار نے ایرانی کو جواب دیا کہ۔

دیوان غالب نہ دارم غالب دارم۔۔۔

یہ سن کر ایرانی چونکا اور اب جو اس نے مرزا صاحب کو دیکھا تو بہت شرمندہ ہوا۔ مرزا صاحب اسے خجل دیکھ کر یہ کہتے ہوئے لپٹ گئے کہ:

شرمانے کی بات نہیں ہے واللہ ساری عمر میں سچی داد آج ہی ملی ہے۔۔۔

☺☺☺

ایک روز مرزا صاحب، فتح الملک بہادر سے ملنے ان کے یہاں گئے اور جب غلام گردش میں پہنچے تو خدمت گار نے صاحب عالم کو اطلاع دی کہ مرزا نوشہ صاحب آرہے ہیں، وہ کسی کام میں مشغول تھے اس لئے مرزا صاحب کو فوراً نہ بلا سکے۔۔ مرزا صاحب کچھ دیر وہیں ٹہلتے رہے بعد میں صاحب عالم نے پکار کر ملازم سے فرمایا کہ: ارے مرزا صاحب کہاں ہیں۔۔؟

مرزا صاحب نے یہ سن کر وہیں سے جواب دیا۔

غلام گردش میں ہے۔

یہ سن کر صاحب عالم خود باہر تشریف لے آئے اور فوراً مرزا صاحب کو اپنے ساتھ اندر لے گئے۔

☺☺☺

ایک بار دلی میں رات گئے کسی مشاعرے یا دعوت سے مرزا صاحب مولانا فیض الحسن سہارن پوری کے ہمراہ واپس آرہے تھے راستے میں ایک تنگ اور تاریک گلی سے گزر رہے تھے کہ آگے وہیں ایک گدھا کھڑا تھا۔۔۔ مولانا فیض نے یہ دیکھ کر کہا۔ مرزا صاحب، دلی میں گدھے بہت ہیں۔

مرزا صاحب نے بے ساختہ کہا۔

نہیں صاحب باہر سے آجاتے ہیں۔

مولانا فیض الحسن سہارن پوری جھینپ کر چپ ہو گئے۔

☺☺☺

ہنگام غدر 1857 میں جب دہلی میں ہر طرف لوٹ مار کا بازار گرم تھا، مرزا صاحب کی بیگم نے اپنی قیمتی چیزیں اور زیورات زمیں میں دفن کردئے۔ اتفاق سے فتح مند سپاہیوں کو اس کی خبر لگ گئی اور انہوں نے کھود کر سب کچھ نکال لیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مرزا صاحب کو تنگ دستی نے آگھیرا اور کپڑے بیچ بیچ کر گزارہ کرنا پڑا۔

اسی زمانے میں مرزا صاحب نے کسی کو خط لکھا تو یوں کہ۔۔۔ اس ناداری کے زمانے میں جس قدر کپڑا اور اوڑھنا بچھونا گھر میں تھا سب بیچ بیچ کر کھا گیا گویا لوگ روٹی کھاتے تھے اور میں کپڑا کھاتا تھا۔

☺☺☺

ایک بار مرزا صاحب کے کسی شاگرد نے آکر ان سے بڑے فخریہ لہجہ میں کہا کہ:

حضرت، آج میں حضرت امیر خسرو کی قبر پر گیا تھا مزار پر ایک کھرنی کا درخت ہے اس کی کھرنیاں میں نے خوب کھائیں۔ بس کھرنیوں کا کھانا تھا کہ گویا فصاحت و بلاغت کا دروازہ کھل گیا۔ دیکھئے تو میں کیسا فصیح و بلیغ ہوگیا ہوں۔ مرزا صاحب نے ان سے بڑی متانت سے کہا۔ ارے میاں تین کوس کیوں گئے۔ میرے پچھواڑے کے پیپل کی پیپلیاں کیوں نہ کھائیں۔ چودہ طبق روشن ہو جاتے۔

☺☺☺
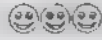
ایک مرتبہ اپنی بہن چھوٹی خانم کی بیماری کو سن کر مرزا صاحب ان کی عیادت کو گئے اور پوچھا۔

کیا حال ہے۔۔؟

وہ بولیں: ’’ مرتی ہوں، البتہ قرض کی فکر ہے کہ گردن پر لئے جاتی ہوں۔۔‘‘

بولے بھلا یہ کیا فکر ہے خدا کے ہاں کیا مفتی صدر الدین خاں بیٹھے ہیں جو ڈگری کر کے پکڑوالیں گے۔

☺☺☺

ایک رات مرزا صاحب پلنگ پر لیٹے ہوئے تھے ستاروں کو دیکھ کر بولے جو بھی کام خود رائی سے کیا جاتا ہے اکثر بے ڈھنگا ہوتا ہے۔ ستاروں کو دیکھو کس ابتری سے بکھرے ہوئے ہیں؟ نہ تناسب ہے ۔ نہ انتظام ہے۔ نہ بیل ہے۔ نہ بوٹا ہے۔ مگر بادشاہ خود مختار ہے کوئی دم نہیں مار سکتا۔

☺☺☺
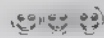
ایک دفعہ مرزا صاحب نے رمضان کے مہینہ میں ایک دوست کو خط میں لکھا۔ دھوپ بہت تیز ہے۔ روزہ رکھتا ہوں۔ مگر روزے کو بہلاتا رہتا ہوں۔ کبھی پانی پی لیا، کبھی حقہ پی لیا، کبھی کوئی ٹکڑا روٹی کا کھا لیا۔ یہاں کے لوگ عجیب ہیں۔ میں تو روزہ بہلاتا ہوں اور یہ صاحب فرماتے ہیں کہ روزہ نہیں رکھتا۔ یہ نہیں سمجھتے کہ روزہ نہ رکھنا اور چیز ہے اور روزہ بہلانا اور بات ہے۔

☺☺☺

ایک دفعہ سراج الدین بہادر شاہ بادشاہ کے دربار میں حضرت سلطان خواجہ نظام الدین اولیا محبوب الٰہی اور حضرت امیر خسرو علیہ الرحمہ کا تذکرہ ہو رہا تھا مرزا صاحب بھی وہاں موجود تھے۔ انھوں نے اسی وقت یہ شعر موزوں کر کے پڑھا۔

ملے دو مرشدوں کو قدرت حق سے ہے دو قالب نظام الدین کو خسرو سراج الدین کو غالب

یہ سن کر سب اہل دربار ہنس پڑے۔

☺☺☺
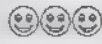
آموں کا موسم تھا۔ بہادر شاہ بادشاہ چند مصاحبوں کے ہمراہ جن میں مرزا صاحب بھی تھے باغ حیات بخش یا مہتاب باغ میں گلگشت کر رہے تھے۔ آم کے درخت رنگ برنگ کے آموں سے لد رہے تھے۔ یہاں کے آم اعلی درجہ کے ہوتے تھے اور صرف بادشاہ اور بیگمات کے لیے مخصوص تھے یا دوسرے ملکوں کے بادشاہوں کو تحفہ کے طور پر بھیجے جاتے تھے مرزا صاحب کو آم بے حد مرغوب تھے اور درختوں پر آموں کو بار بار غور سے دیکھتے تھے۔ بادشاہ نے پوچھا مرزا اس قدر غور سے کیا دیکھتے ہو۔ مرزا نے دست بستہ عرض کیا۔ پیر و مرشد جو کسی بزرگ نے کہا ہے۔

برسر ہر دانہ نبو شتہ عیاں کز فلاں ابن فلاں ابن فلاں

اس کو دیکھتا ہوں کہ کسی دانہ پر میرا اور میرے باپ دادا کا نام بھی لکھا ہے یا نہیں۔

بادشاہ یہ سن کر مسکرائے اور اسی روز مرزا صاحب کو عمدہ عمدہ آموں کی ایک ٹوکری بھجوائی۔

☺☺☺

ایک مجلس میں جہاں مرزا صاحب بھی موجود تھے آموں کی نسبت گفتگو ہو رہی تھی۔ ہر شخص اپنی اپنی رائے بیان کر رہا تھا کہ آم میں کیا کیا خوبیاں ہونی چاہئیں۔ کسی نے مرزا صاحب سے پوچھا کہ آپ کی رائے میں آم کیسا ہونا چاہیئے۔ مرزا صاحب نے جواب دیا بھئی میرے نزدیک تو آم میں صرف دو باتیں ہونی چاہئیں۔

میٹھا اور بہت ہو۔ یہ سن کر سب سامعین ہنس پڑے۔

☺☺☺

دہلی میں مرزا صاحب کے زمانے میں بعض لوگ رتھ کو مونث بولتے تھے اور بعض لوگ مذکر۔ کسی نے مرزا صاحب سے پوچھا کہ حضرت ! رتھ مونث ہے یا مذکر؟ مرزا صاحب نے جواب دیا۔ بھیا

جب رتھ میں عورتیں بیٹھی ہوں تو مونث کہو اور جب مرد بیٹھے ہوں تو مذکر سمجھو۔

☺☺☺
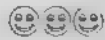
ایک دفعہ مرزا صاحب کو بے قصور ہونے کے باوجود انگریزوں کی جیل میں رہنا پڑا۔ جب رہائی ہوئی تو اپنے دوست میاں کالے کے ہاں آ کر رہنے لگے۔ ایک دن میزبان کے پاس بیٹھے تھے کہ کسی نے آ کر قید سے چھوٹنے کی مبارک باد دی۔ مرزا صاحب بولے۔

کون بھڑوا قید سے چھوٹا ہے۔ پہلے گورے کی قید میں تھا اب کالے کی قید میں ہوں۔

☺☺☺

ایک دفعہ پنڈت موتی لال، میر منشی لفٹننٹ گورنر بہادر پنجاب مرزا صاحب کے مکان پر آئے۔ دوران گفتگو میں پنشن کا بھی ذکر آیا مرزا صاحب نے کہا۔ تمام عمر میں ایک دن شراب نہ پی ہو تو کافر اور ایک دفعہ نماز پڑھی ہو تو گنہگار۔ پھر میں نہیں جانتا کہ سرکار نے کس طرح مجھے باغی مسلمانوں میں شمار کیا۔

☺☺☺

رمضان کا مہینہ اور عصر کا وقت تھا ایک سنی مولوی مرزا صاحب کے ہاں آئے۔ مرزا صاحب نے نوکر سے پانی مانگا۔ مولوی صاحب نے متعجب ہو کر پوچھا۔ کیا جناب کا روزہ نہیں ہے؟ مرزا صاحب نے جواب دیا سنی مسلمان ہوں۔ چار گھڑی دن رہے روزہ کھول لیتا ہوں۔

☺☺☺
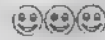
ایک دفعہ بہادر شاہ بادشاہ نے مرزا صاحب سے پوچھا مرزا تم روزہ کیوں نہیں رکھتے؟ مرزا صاحب نے عرض کیا پیر و مرشد ! جب کچھ کھانے کو نہیں ملتا تو روزہ ہی کھا لیتا ہوں۔ بادشاہ یہ سن کر ہنس پڑے۔

☺☺☺

جاڑے کا موسم تھا، ایک طوطا پنجرے میں سردی کے مارے پروں میں منہ چھپائے بیٹھا تھا، مرزا صاحب طوطے سے کہنے لگے۔ میاں مٹھو! نہ تمہارے جورو نہ بچے تم کس فکر میں یوں سر جھکائے بیٹھے ہو؟

☺☺☺
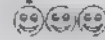
مرزا صاحب آخر عمر میں موت کی بہت آرزو کرتے تھے ان کا مشہور شعر ہے۔

مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی موت آتی ہے پر نہیں آتی

انہوں نے کئی دفعہ اپنے مرنے کی تاریخ کہی۔ مگر ہر دفعہ غلط نکلی 1277ھ میں انہوں نے غالب مرد تاریخ کہی ان کے شاگرد منشی جواہر سنگھ جوہر نے ان سے کہا کہ حضرت ! انشا اللہ یہ مادہ بھی غلط ثابت ہوگا۔ وہ بولے دیکھو صاحب ! تم ایسی فال بدمنہ سے نہ نکالو۔ اگر یہ مادہ ٹھیک نہ نکلا تو میں سر پھوڑ کر مرجاؤں گا۔

😊😊😊

ایک دفعہ دہلی میں وبا پھیلی۔ میر مہدی مجروح نے جو مرزا صاحب کے شاگردوں میں سے تھے مرزا صاحب سے بذریعہ خط دریافت کیا کہ حضرت ! وبا شہر سے دفع ہوئی یا ابھی تک موجود ہے؟ مرزا صاحب نے جواب میں لکھا بھئی کیسی وبا؟ جب مجھ جیسے چھیاسٹھ برس کے بڈھے اور چونسٹھ برس کی بڑھیا (غالب کی اہلیہ) کو نہ مار سکی تو تف بریں وبا۔

😊😊😊

ایک دفعہ مرزا صاحب نے بہادر شاہ بادشاہ کو اپنی غزل سنائی یہ مقطع پڑھا

یہ مسائل تصوف یہ ترا بیان غالب تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

تو بادشاہ نے کہا بھئی ہم تو جب بھی ایسا نہ سمجھتے، مرزا صاحب نے کہا۔ حضور تو اب بھی ایسا ہی سمجھتے ہیں مگر یہ اس لئے ارشاد ہوا کہ میں اپنی ولایت پر مغرور نہ ہو جاں۔

😊😊😊

مرزا غالب بہادر شاہ بادشاہ کے مقربوں میں تھے۔ جب بادشاہ کوئی عمدہ چیز پکواتے تو ان کے ہاں تحفتہ بھیجا کرتے تھے۔ ایک دفعہ بادشاہ نے ان کو چوبدار کے ہاتھ بیسنی روٹیاں بھیجیں۔ جب چوبدار مرزا صاحب کو روٹیاں دے کر چلا گیا تو ایک دیہاتی طالب علم نے جو مرزا صاحب سے پڑھتا تھا اور وہیں موجود تھا مرزا صاحب سے پوچھا کہ بیسنی روٹی ایسی کیا نادر چیز ہے کہ بادشاہ کی سرکار سے تحفہ کے طور پر تقسیم ہوتی ہے؟ مرزا صاحب نے کہا۔

ارے احمق ! چنا وہ چیز ہے کہ اس نے ایک دفعہ جناب الٰہی میں فریاد کی تھی کہ دنیا میں مجھ پر بڑے

ظلم ہوتے ہیں۔ مجھے دلتے ہیں۔ پیستے ہیں۔ بھونتے ہیں۔ پکاتے ہیں اور مجھ سے سینکڑوں کھانے کی چیزیں بنا کر کھاتے ہیں۔ جیسا مجھ پر ظلم ہوتا ہے ایسا کسی پر نہیں ہوتا۔ وہاں سے حکم ہوا اے چنے تیری خیر اسی میں ہے کہ ہمارے سامنے سے چلا جائے ورنہ ہمارا بھی یہی جی چاہتا ہے کہ تجھ کو کھا جائیں۔ مرزا صاحب نے ان بیسنی روٹیوں کے شکریہ میں ذیل کا قطعہ بادشاہ کے حضور میں پڑھا۔

نہ پوچھ اس کی حقیقت حضور والا نے مجھے جو بھیجی ہے بیسن کی روغنی روٹی

نہ کھاتے گیہوں، نکلتے نہ خلد سے باہر جو کھاتے حضرت آدم یہ بیسنی روٹی

ایک دفعہ مرزا صاحب نے ایک دوست کو دسمبر 1858 کی آخری تاریخوں میں خط ارسال کیا۔ دوست نے جنوری 1859 کی پہلی یا دوسری تاریخ کو جواب لکھا۔ مرزا صاحب ان کو خط لکھتے ہیں۔ ''دیکھو صاحب یہ باتیں ہم کو پسند نہیں 1858 کے خط کا جواب 1859 میں بھیجتے ہو اور مزا یہ کہ جب تم سے کہا جائے گا تو یہ کہو گے کہ میں نے دوسرے ہی دن جواب لکھا تھا۔''

مولوی فضل حق صاحب کی عادت تھی کہ جب ان کا کوئی بے تکلف دوست ان سے ملنے آتا تو خالق باری کا یہ مصرع پڑھ کر اس کا خیر مقدم کرتے

بیا برادر آ رے بھائی

ایک روز مرزا صاحب ان سے ملنے گئے تو انہوں نے کھڑے ہو کر استقبال کیا اور یہی مصرع پڑھا۔ اتنے میں مولوی صاحب کی طوائف دوسرے دالان سے نکل کر آ گئی تو مرزا صاحب نے مولوی صاحب سے کہا ہاں صاحب !اب وہ دوسرا مصرع بھی پڑھ دیجیے۔

بنشیں مادر بیٹھ ری مائی

ایک دفعہ ایک صاحب جن کی وضع سے معلوم ہوتا تھا کہ نہایت متقی اور پرہیز گار شخص ہیں، مرزا صاحب سے ملنے آئے۔ مرزا صاحب نے ان کی بڑی خاطر مدارات کی۔ سامنے میز پر گلاس اور

شراب کا شیشہ رکھا تھا۔ انہوں نے شربت کا شیشہ سمجھ کر اسے اٹھالیا۔ پاس سے کوئی شخص بولا کہ جناب شراب ہے۔ انہوں نے جھٹ اس کو میز پر رکھ دیا اور کہا کہ میں نے تو شربت کے دھوکے میں اٹھایا تھا۔ مرزا صاحب مسکرا کر بولے۔ زہے نصیب! دھوکے میں نجات ہوگئی۔

😊😊😊

ایک دفعہ فرخ مرزا نے مرزا صاحب سے پوچھا کہ حضرت ! بسمل کے کیا معنی ہیں اس وقت مرزا صاحب ایک گاؤ تکیہ پر سر رکھے اور ٹانگیں اکٹھی کئے ہوئے کسی قدر اوندھے لیٹے تھے۔ کہنے لگے جس حالت میں اس وقت میں ہوں، سمجھ لو کہ اس حالت والے کو بسمل کہتے ہیں۔

😊😊😊

ایک مرتبہ کسی شخص نے مرزا صاحب کو عمدہ عمدہ آموں کا ٹوکرا تحفہ کے طور بھیجا۔ مرزا صاحب نے ٹوکرے کو کھول کر دیکھا تو فرمایا لطف خاص نہیں فیض عام ہے۔ شراب نہیں آم ہے۔

😊😊😊

مرزا صاحب کے خسر مرزا الٰہی بخش خاں پیری مریدی بھی کرتے تھے اور اپنے سلسلے کے شجرہ کی ایک کاپی اپنے مریدوں کو دیا کرتے تھے۔ ایک دفعہ انہوں نے مرزا صاحب سے شجرہ نقل کرنے کے لیے کہا۔ مرزا صاحب نے نقل تو کردی مگر اس طرح کہ ایک نام لکھ دیا، دوسرا چھوڑ دیا۔ تیسرا پھر لکھ دیا چوتھا حذف کردیا۔ ان کے خسر صاحب یہ نقل دیکھ کر نہایت ناراض ہوئے کہ یہ کیا غضب کیا۔ وہ بولے:۔

حضرت! آپ اس کا خیال نہ فرمایئے۔ شجرہ دراصل خدا تک پہنچنے کا ایک زینہ ہے۔ سو زینے کی ایک ایک سیڑھی اگر بیچ میں سے نکال دی جائے تو چنداں ہرج واقع نہیں ہوتا۔ آدمی ذرا اچک اچک کے اوپر چڑھ سکتا ہے۔ ان کے خسر صاحب یہ سن کر بہت ناراض ہوئے اور انہوں نے وہ نقل پھاڑ ڈالی اور پھر کبھی مرزا صاحب سے شجرہ نقل کرنے کی فرمائش نہیں کی۔

😊😊😊

لکھنو کی ایک مجلس میں دہلی اور لکھنو کی زبان پر بحث ہو رہی تھی۔ مرزا غالب بھی وہاں موجود تھے۔ کسی نے ان سے کہا کہ جس موقع پر اہل دہلی اپنے تئیں بولتے ہیں وہاں اہل لکھنو آپ کو بولتے

ہیں۔آپ کی رائے میں فصیح آپ کو ہے یا اپنے تئیں مرزا صاحب فرماتے ہیں:۔
فصیح تو یہی معلوم ہوتا ہے جو آپ بولتے ہیں۔مگر اس میں دقت یہ ہے کہ مثلاً آپ میری بابت یہ فرمائیں کہ میں آپ کو فرشتہ خصل جانتا ہوں اور میں اس کے جواب میں اپنی نسبت عرض کروں کہ میں تو آپ کو کتے سے بھی بدتر سمجھتا ہوں تو سخت مشکل ہوگی میں تو اپنی نسبت کہوں گا اور آپ ممکن ہے کہ اپنی نسبت سمجھ جائیں۔ یہ لطیفہ سن کر سب سامعین پھڑک گئے۔

ایک دفعہ مرزا صاحب بہت قرض دار ہوگئے اور بوجہ تنگدستی کے قرض ادا نہ کرسکے ادھار دینے والے نے ان پر مقدمہ چلایا۔ چنانچہ مرزا صاحب کو عدالت میں جواب دہی کے لئے طلب کیا گیا ۔ جب مرزا صاحب مفتی صاحب کے روبرو پیش ہوئے تو فرمایا۔

قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

مفتی صاحب نے مرزا صاحب کے خلاف ڈگری تو دے دی مگر ان کا قرضہ اپنی جیب سے ادا کردیا۔

ایک دفعہ حسین علی خاں کے چھوٹے لڑکے نے مرزا صاحب سے کہا دادا جان مٹھائی منگا دو۔مرزا صاحب نے کہا پیسے نہیں ہیں۔اس نے مرزا صاحب کا صندوقچہ کھولا۔اور پیسے ڈھونڈنے لگا۔مرزا صاحب نے فوراً کہا۔

درہم ودام اپنے پاس کہاں؟ چیل کے گھونسلے میں ماس کہاں؟

ایک دفعہ رمضان کے مہینہ میں مرزا غالب نواب حسین مرزا کے ہاں گئے اور پان منگا کر کھایا۔ ایک متقی پرہیز گار شخص جو پاس ہی بیٹھے تھے بڑے متعجب ہوئے اور پوچھا کہ حضرت آپ روزہ نہیں رکھتے ۔مرزا صاحب نے مسکرا کر کہا شیطان غالب ہے۔

ایک دفعہ مرزا صاحب نے مسہل لیا۔حکیم نے مسہل کے دنوں میں چلنے پھرنے سے منع کیا۔ چنانچہ مرزا صاحب کئی روز تک گھر ہی میں لیٹے رہے۔جب مسہل کے دن ختم ہوئے تو دربار شاہی میں حاضر ہوکر اتنے روز کی غیر حاضری کے عذر میں یہ قطعہ پڑھا۔

سہل تھی مسہل و لے یہ سخت مشکل آ پڑی　مجھ پہ کیا گزرے گی اتنے روز حاضر بن ہوئی
تین دن مسہل سے پہلے تین دن مسہل کے بعد　تین مسہل تین تبریدیں یہ سب کے دن ہوئی

😊😊😊

ایک خط میں مرزا صاحب امین الدین خاں کو لکھتے ہیں:۔

آج تم دونوں بھائی اس خاندان میں شرف الدولہ اور فخر الدولہ کی جگہ ہو۔ میں لم یلد ولم یولد ہوں۔

😊😊😊

غدر کے بعد مرزا کی معاشی حالت دو برس تک دگرگوں رہی۔ آخر نواب یوسف علی خاں رئیس رامپور نے سو روپیہ ماہانہ تاحیات وظیفہ مقرر کر دیا۔ ان کی وفات کے بعد نواب کلب علی خاں نے بھی اس وظیفے کو جاری رکھا۔ چند روز بعد نواب کلب علی خاں لیفٹیننٹ گورنر سے ملنے بریلی کو روانہ ہوئے تو چلتے وقت مرزا صاحب سے کہنے لگے۔ خدا کے سپرد۔

مرزا صاحب نے کہا۔

حضرت! خدا نے مجھے آپ کے سپرد کیا ہے۔ آپ پھر واپس خدا کے سپرد کر رہے ہیں۔

😊😊😊

امراو سنگھ جوہر گوپال تفتہ کے عزیز دوست تھے۔ ان کی دوسری بیوی کے انتقال کا حال تفتہ نے مرزا صاحب کو بھی لکھا، تو انہوں نے جواباً لکھا۔

امراو سنگھ کے حال پر اس واسطے مجھ کو رحم اور اپنے واسطے رشک آتا ہے۔ اللہ اللہ ! ایک وہ ہیں کہ دوبارہ ان کی بیڑیاں کٹ چکی ہیں اور ایک ہم ہیں کہ پچاس برس سے اوپر پھانسی کا پھندہ گلے میں پڑا ہے، نہ پھندا ہی ٹوٹتا ہے نہ دم ہی نکلتا ہے۔

😊😊😊

مرزا غالب کو ایک بار یکمشت رقم ملی۔ وہ اس رقم سے شراب خرید کر خوشی خوشی مکان پہنچے۔ بیوی نے کہا وہ ضروری اخراجات کے لئے کچھ رقم محفوظ کر لیتے تو بہتر تھا۔ غالب نے کہا۔ رزق دینے کا اللہ تعالی نے وعدہ فرمایا ہے شراب کے دینے کا نہیں۔ اس لئے میں نے شراب خرید لی۔

😊😊😊

غالب کے ایک شاگرد نے ان سے مل کر کہا کہ وہ حصول روزگار کے لیے بنارس جانا چاہتے ہیں۔ کچھ عرصہ بعد انہوں نے غالب کے پاس حاضر ہو کر اطلاع دی کہ وہ کل شام بنارس جا رہا ہے۔ غالب نے کہا کہ بھائی ضرور جاؤ اور وہاں کے خدا کی خدمت میں میری طرف سے آداب بجالا۔ شاگرد یہ سن کر حیران ہو گیا اور مرزا سے پوچھا کہ کیا دلی کا خدا الگ اور بنارس کا الگ ہے؟ مرزا غالب نے مسکراتے ہوئے کہا کہ دلی کا خدا چونکہ اسے روزگار فراہم کرنے سے قاصر ہے جس کی بنا پر وہ بنارس جا رہا ہے۔ شاگرد نے غالب کے اشارہ کو سمجھتے ہوئے بنارس کا سفر ملتوی کر دیا۔

☺☺☺
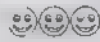
اکثر لوگ پنشن کا حال دریافت کرنے کو خط بھیجتے تھے۔ ایک دفعہ میر مہدی نے اسی مضمون کا خط بھیجا تھا۔ اس کے جواب میں مرزا صاحب لکھتے ہیں میاں بے رزق جینے کا ڈھب مجھ کو آ گیا ہے؛ اس طرف سے خاطر جمع رکھنا۔ رمضان کا مہینہ روزے کھا کھا کر کاٹا؛ آگے خدا رزاق ہے؛ کچھ اور کھانے کو نہ ملا تو غم تو ہے۔

☺☺☺

ایک روز حافظ داد اور کنور ابراہیم علی خاں سویرے سویرے مرزا صاحب کے مکان پر پہنچے۔ دیوان خانہ خالی تھا۔ دونوں حضرات وہیں مونڈھوں پر بیٹھ کر انتظار کرنے لگے۔ یکایک مرزا صاحب ننگے سر، پاں میں کف پوئیاں پہنے اور سیدھے ہاتھ میں برانڈی کی خالی بول لیے برآمد ہوئے۔ مرزا کے ہاتھ میں خالی بوتل دیکھ کر ان دونوں صاحبان کی ہنسی روکے نہیں رکی۔ کنور صاحب نے کہا:
آپ کا پینے کا شوق کیا اتنا بڑھ گیا ہے کہ بیت الخلا میں بھی بوتل ساتھ جانے لگے۔ مرزا صاحب نے جواب دیا، توبہ کیجیے توبہ۔ اپنے منہ پر تھپڑ ماریے، شراب جیسی چیز بیت الخلا میں نہیں جا سکتی۔ میں اس کی حرمت کو خوب پہچانتا ہوں۔

☺☺☺

ایک دن کسی محفل میں مولانا صہبائی کا ذکر آیا تو مرزا غالب نے کہا کہ:
مولانا نے بھی کیا عجیب و غریب تخلص رکھا ہے، عمر بھر میں ایک چلو پینا نصیب نہیں ہوئی اور صہبائی

تخلص رکھا ہے، سبحان اللہ قربان جایئے اس اتقا کے اور صدقے جایئے اس تخلص کے!

☺☺☺

ایک شام مرزا کو شراب نہ ملی تو نماز پڑھنے چلے گئے۔ اتنے میں ان کا ایک شاگرد آیا اور اسے معلوم ہوا کہ مرزا کو آج شراب نہیں ملی، چنانچہ وہ مسجد کے سامنے پہنچا اور وہاں سے بوتل دکھائی، مرزا وضو کرنے کے بعد مسجد سے نکلے تو کسی نے کہا۔ یہ کیا؟ کہ بغیر نماز پڑھے چل دیے۔

مرزا نے کہا۔ ''جس چیز کے لیے دعا مانگنا تھی۔ وہ تو یونہی مل گئی۔''

☺☺☺

مرزا صاحب کھانا کھا رہے تھے، ڈاکیہ ایک لفافہ لا کر دیا۔ لفافے کی بے ربطی اور کاتب کے نام کی اجنبیت سے ان کو یقین ہو گیا کہ کسی مخالف کا ویسا ہی گمنام خط ہے، جیسے پہلے آ چکے ہیں۔ لفافہ پاس بیٹھے شاگرد کو دیا کھول کر پڑھو۔ سارا خط فحش اور دشنام سے بھرا ہوا تھا۔ پوچھا! کس کا خط ہے؟ اور کیا لکھا ہے؟ شاگرد کو اس کے اظہار میں تامل ہوا فوراً اس ہاتھ سے لفافہ چھین کر خود پڑھا۔ اس میں ایک جگہ ماں کی گالی بھی لکھی تھی مسکرا کر کہنے لگے کہ

الو کو گالی بھی نہیں آتی۔ بڈھے یا ادھیڑ عمر کو بیٹی کی دیتے ہیں تا کہ اس کو غیرت آئے۔ جوان کو جورو کی گالی دیتے ہیں۔ کیونکہ اس کی جورو سے زیادہ تعلق ہوتا ہے۔ بچے کو ماں کی گالی دیتے ہیں کہ وہ ماں کے برابر کسی سے مانوس نہیں ہوتا۔ یہ قرمساق جو بہتر برس کے بڈھے کو ماں کی گالی دیتا ہے، اس سے زیادہ کون بیوقوف ہوگا۔؟

☺☺☺

ایک مرتبہ ایک صاحب جو مرزا صاحب سے ملاقات کے مشتاق تھے، بنارس سے دلی تشریف لائے اور مرزا صاحب کے یہاں حاضر ہوئے ادھر ادھر کی باتیں کیں اور ساتھ ہی مرزا صاحب سے ان کے ایک شعر کی بہت تعریف کی۔ مرزا صاحب کو جب تاب نہ ہوئی تو ان سے پوچھا کہ حضرت وہ کون سا شعر ہے۔۔۔؟

اسد! اس جفا پر بتوں سے وفا کی مرے شیر شاباش رحمت خدا کی

مرزا صاحب نے شعر سن کر کہا۔

اگر یہ کسی اور اسد کا شعر ہے تو اس پر خدا کی رحمت ہو اور اگر مجھ اسد کا یہ شعر ہے تو مجھ پر لعنت خدا کی۔

ماہرے کی خانقاہ کے بزرگ سید صاحب عالم نے غالب کو ایک خط لکھا۔ ان کی تحریر نہایت شکستہ تھی۔ جسے پڑھنا جوئے شیر لانے کے برابر تھ۔ غالب نے انہیں جواب دیا: پیرو مرشد، خط ملا، چوما چاٹا، آنکھوں سے لگایا، آنکھیں پھوٹیں جو ایک حرف بھی پڑھا ہو۔ تعویذ بنا کر تکیہ میں رکھ لیا۔

نجات کا طالب غالب
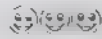
مولانا فضل حق کے شاگردوں میں ایک شخص نے ناصر علی سرہندی کے کسی شعر کے معنی مرزا صاحب سے جا کر پوچھے۔ انھوں نے کچھ معنی بیان کیے۔ اس نے وہاں سے آکر مولانا سے کہا آپ مرزا صاحب کی سخن فہمی اور سخن سنجی کی اس قدر تعریف کرتے ہیں، آج انھوں نے ایک شعر کے معنی بالکل غلط بیان کیے: اور پھر وہ شعر پڑھا؛ اور جو کچھ مرزا نے اس کے معنی کہے تھے بیان کیے۔ مولانا نے فرمایا پھر ان معنوں میں کیا برائی ہے؟ اس نے کہا برائی تو کچھ ہو یا نہ ہو مگر ناصر علی کا مقصود یہ نہیں ہے۔ مولانا نے کہا اگر ناصر علی نے وہ معنی مراد نہیں لیے جو مرزا نے سمجھے ہیں تو اس نے سخت غلطی کی۔
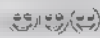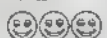
مرزا نے ایک غزل کے مقطع میں اپنے تئیں کم از کم شیخ علی حزیں کا مثل قرار دیا ہے۔ مومن خاں مرحوم نے جس وقت وہ مقطع سنا تو کہنے لگے کہ اس میں بالکل مبالغہ نہیں ہے۔ مرزا کو ہم کسی طرح علی حزیں سے کم نہیں سمجھتے، ایک صاحب نے جو مومن خاں مرحوم کی تعلیموں سے خوب واقف تھے یہ حکایت سنا کر کہا کہ مومن خاں نے یہ اس لئے کہا کہ وہ اپنا رتبہ یقیناً شیخ علی حزیں سے برتر و بلند سمجھتے تھے ورنہ وہ ہرگز مرزا کو شیخ کے برابر تسلیم نہ کرتے۔

جس مکان میں مرزا رہتے تھے اس کے دروازے پر ایک کمرہ تھا؛ اور کمرے کے آگے ایک برآمدہ تھا جس کے نیچے رستہ چلتا تھا۔ یہ برآمدہ گذرگاہ سے تقریباً چار گز اونچا ہوگا۔ ایک روز کی بارش

ہورہی تھی اور مرزا صاحب برآمدے میں بیٹھے ہوئے ابرو باراں کی مدارات میں مصروف تھے۔ اس وقت عالم سرخوشی میں فرمانے لگے جی چاہتا ہے ایسا برسے کہ گلی کا روکا پانی برآمدے تک آجائے اور میں یہیں بیٹھا بیٹھا گلاس بھر بھر پانی پیوں۔ کسی نے کہا حضرت! برآمدئے تک پانی آگیا تو شہر پہلے ڈوب جائے گا۔ مرزا ہنس کر چپکے ہورہے۔

☺☺☺

مولف برہان قاطع سے اختلاف کرتے ہوئے ایک جگہ مرزا صاحب فرماتے ہیں۔ چوں شناسائی حقیقت جو در لفظ ندارد فرہنگ چرامے۔ بوریہ مے یافت۔ رسی مے یافت۔ ہنرم مے فروخت گلخن افروخت۔۔۔ یعنی جب لفظ و معنی کی حقیقت نہیں پہچانتا تو پھر فرہنگ نویسی کی زحمت کیوں برداشت کی۔ بوریا بنتا۔ رسی بنتا۔ لکڑیں بیچتا۔ بھاڑ جھونکتا۔

☺☺☺

مولف برہان قاطع نے فراز کو لغات اضداد میں سے ٹھہرایا ہے اور بند کرنا، کھولنا دونوں معنی لکھے ہیں۔۔۔ مرزا صاحب اس کے مخالف تھے وہ کہتے تھے اس کے معنی صرف بند کرنے کے ہیں۔۔۔ مگر اہل ہندوستان کا اجماع ہے کہ یہ لفظ لغات اضداد میں ہے۔ چنانچہ مرزا صاحب کو جب لکھا کہ اس پر اجماع ہے تو انھوں نے جواب دیا۔

۔۔۔ ایسا ہی اجماع ہے جیسے اہل شام نے بیعت یزید پر اجماع کیا تھا۔

☺☺☺

مرزا حاتم علی مہر کی محبوبہ کے انتقال کی خبر سن کر انھیں ان الفاظ میں تعزیت کی۔

تمہاری محبوبہ تمہارے سامنے مری۔ تم اس سے بڑھ کر ہوئے کہ لیلیٰ اپنے گھر میں اور تمہاری معشوقہ تمہارے گھر میں مری۔ بھئی مغل بچے بھی غضب کے ہوتے ہیں۔ جس پر مرتے ہیں اس کو مار رکھتے ہیں۔ میں بھی مغل بچہ ہوں عمر بھر میں ایک بڑی ستم پیشہ ڈومنی کو میں نے بھی مار رکھا ہے۔ خدا ان دونوں کو بخشے اور ہم تم دونوں کو بھی!

☺☺☺

مرزا غالب اپنے آخری ایام میں حکیم محمود خاں کے دیوان خانہ کے قریب مسجد کے پیچھے آکر رہنے

لگے تھے۔ ایک دن کسی صاحب نے کسی محفل میں مرزا صاحب سے دریافت کیا کہ حضرت مکان کہاں ہے؟ مرزا صاحب نے برجستہ فرمایا۔۔

مسجد کے زیر سایہ اک گھر بنایا ہے یہ بندہ کمینہ ہم سایہ خدا ہے

ایک مرتبہ مفتی صدرالدین خاں آزردہ فینس میں سوار ہو کر اپنے مکان تشریف لے جا رہے تھے چونکہ ذرا جلدی تھی اس لئے کہاروں کو کندھا بدلنے کے لیے منع بھی کر دیا تھا۔ راستے میں مرزا صاحب کا مکان بھی تھا مگر جلدی کی وجہ سے اس وقت مرزا صاحب کے ہاں رکنا مناسب نہ سمجھا اور بغیر ملے نکل گئے۔ مرزا صاحب نے اتفاقاً انہیں دیکھ لیا تھا چنانچہ فوراً ملازم کے ہاتھ ایک رقعہ میں یہ شعر لکھ کر بھجوا دیا۔

فینس میں گزرتے ہیں جو کوچے سے وہ میرے کندھا بھی کہاروں کو بدلنے نہیں دیتے

مفتی صاحب رقعہ پاتے ہی الٹے پاں مرزا صاحب سے ملنے آئے۔

ایک روز کسی مجلس میں نماز کا ذکر چل نکلا مرزا صاحب بھی موجود تھے انھوں نے کہا۔

کیوں صاحب! ہم تو مرد ہیں ہمارا نماز پڑھنا ٹھیک ہے۔ ہم نماز پڑھتے ہیں تو اس لئے کہ حوریں ملیں غلمان ملیں۔۔۔ یہ عورتیں آخر کیوں نماز پڑھتی ہیں اور انہیں کس کی تلاش ہے۔۔۔

درج بالا واقعات کو ہم مرزا غالب کے لطیفہ کے طور پر یاد کرتے ہیں۔ لیکن یہ دانستہ لطیفے نہیں بنایا گئے بلکہ یہ ان کی شگفتہ مزاجی کا اثر تھا کہ انھوں نے ہر بات کا بروقت جواب اتنی برجستگی اور خوش بیانی سے دیا تھا کہ آج تک لوگ ان کے واقعات سے لطف اندوز ہوتے رہتے ہیں۔

ریاض قدوائی

زبان وادب میں تمدن اودھ کی دین

اس تحریر کا مقصد اودھ کے محض تمدن اور معاشرتی قدروں پر نظر ڈالنا ہے سوائے اس کے جہاں سیاسی پس منظر کا جائزہ ناگزیر ہو جائے۔ اس تمدن کی تشکیل کس وقت ہو رہی تھی؟ اگر دیکھا جائے تو جنگ پلاسی (نواب سراج الدولہ کی بے دخلی) اور بکسر کی جنگ جس میں نواب شجاع الدولہ کو شکست ہوئی، ان دونوں معرکوں کے درمیان صرف سات سال کا عرصہ حائل تھا مگر اس کے بعد ایک دنیا بدل گئی۔ برطانوی استعمار نے کلکتہ سے اودھ تک اپنے پنجے پھیلا لیئے تھے۔ ان حالات میں لکھنؤ میں نئے تمدن کی صورت گری ہو رہی تھی۔ انگریز تاجر پہلے تو ملک اودھ کے محصول میں حصہ دار بنے پھر حکمرانی میں اور آخر میں 19 ویں صدی آتے آتے پورے اقتدار پر عملاً قبضہ کر کے خود رسمی حکمرانوں کا تقرر کرنے لگے۔ اقتدار گورنر جنرل کا اور مقامی طور پر ریزیڈنٹ کا ہوتا تھا۔ ایک نواب مناجان کو تو انگریز فوج نے آ کر گرفتار بھی کر لیا تھا جیسے جیسے نوابین کے اقتدار کی قطع و برید ہوتی گئی (غازی الدین حیدر کی تخت نشینی پر صاد کرنے کے کچھ عرصہ بعد انگریزوں نے ان کو اور اگلے حکمرانوں کو بادشاہ کا درجہ دے دیا تھا) اسی حد تک اب برائے نام حکمرانوں اور حکمراں طبقہ میں مایوسی اور فرار کا رجحان بڑھتا گیا۔ بیرونی طاقت جب سقوط بکسر کے بعد اودھ کے خطیر محصول میں حصہ دار ہوگئی تو اس مملکت کی حفاظت بھی انگریز فوجوں کا ذمہ ہو گیا۔ آصف الدولہ کی حکومت کو کوئی اہم لڑائی لڑنے کی ضرورت نہیں باقی رہ گئی تھی۔ لہذا شجاع الدولہ کے بعد آنے والے نوابین نے اپنے ایرانی نژاد تصنع (Sophistication) اور شوکت کے خول میں پناہ لی۔ آصف الدولہ کا زور عمارت سازی، حسینوں کی صحبت اور دوست داری میں صرف ہوا۔ مگر وہ اپنے عوام کی طرف

سے بے پرواہ نہیں تھے۔ امیروں اور سرداروں وغیرہ کو بھی ملک کی سیاسی صورت حال کا احساس ہوگیا تھا لہٰذا وقت گذرنے کے ساتھ رفتہ رفتہ خوش وقتی اور تفریحات کا رجحان بڑھتا گیا۔ نت نئے کھیل یا نیم تعمیری مشغلے ایجاد ہوگئے۔

اس لہر کو نام کوئی بھی دیا جائے ----- راہ فرار، بے راہ روی یا اپنی توانائیوں اور وسائل کا غیر تخریبی استعمال---- نواب، امراء اور مصاحبین گفتار کے غازی بن گئے، بازارِ حسن آباد ہوئے خونریزی کے بجائے بٹیروں، مرغوں، کبوتروں، مینڈھوں اور نہ معلوم کس کس کی بازیوں میں نعرہ جنگ گونجنے لگے۔ داستان گوئی، دسترخوان کی زینت، وسعت اور مہک بڑھانے کے نت نئے طریقے، شطرنج، گنجفہ، چوسر، کوڑی بہت کچھ تھا۔

عالم وارفتگی کے اس تہذیبی عہد کا مثبت پہلو یہ تھا کہ مشاعروں، بیت بازیوں، مجروں وغیرہ میں شعروشاعری کی پرداخت ہوئی۔ زبانی الفاظ اور لب ولہجہ کے بعد تحریری زبان کی تراش خراش کی باری آئی۔ دہلی اور دوسرے اطراف سے متعدد شاعروں نے آکر لکھنؤ کو اپنا وطن بنایا۔ نئی اصناف سخن تک ایجاد ہوگئیں۔ جو تھیں ان کو تقویت ملی اور صفاتی اضافے کیے گئے۔ لاتعداد الفاظ اور محاورے وکہاوتیں جو ہندوستان میں اردو میں رائج ہیں اس اسّی سالہ دور اودھ کی پیداوار ہیں۔ شاید اسی سلیس ورواں زبان نے اردو کو تحریری شکل میں باقی رکھا اور دوسری زبانوں کے لیے قابل رشک بنایا۔ محرم کی مجلسیں اور مرثیے بھی اردو زبان کی ساخت و پرداخت کا ایک ذریعہ بن گئے۔ مسلم رئیسوں کی طرح لالاؤں اور کائستھوں کے دیوان خانے بھی زبان و بیان کی بحثوں کے میدان تھے۔ جو کبھی لایعنی اور کبھی نتیجہ خیز ہوتی تھیں۔ یہ بچوں اور بڑوں کے اردو زبان کے مکتب تھے، دوسری طرف ان پڑھ عوام بھی اپنی گفتگو میں محاوروں کے علاوہ تشبیہات واستعاروں کا استعمال کرتے تھے یعنی شاعروں کی تقلید کرنے کی کوشش کرتے تھے۔

شاعری اور ادب

لکھنؤ کی تین چار نسلوں یا مدارج کی شاعری، نثری ادب، داستان گوئی اور داستان نویسی وغیرہ کا سرسری تذکرہ اس تحریر کے دائرہ میں لانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اول اول دہلی اور آگرہ سے

لکھنؤ پہنچنے والے شاعروں میں خان آرزو، میر تقی میر، سودا، میر سید محمد سوز (میر سوز) میر حسن اور کئی دوسرے شامل تھے۔ خان آرزو کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ آصف الدولہ کے ماموں اور شجاع الدولہ کے برادر نسبتی سالار جنگ نے ان کو اصرار کر کے بلایا تھا۔ بعد کی نسلوں میں انشاء، مصحفی، قتیل اور رنگین اور ایسے کئی معروف شاعروں کی صرف پیدائش دہلی، آگرہ یا اطراف میں ہوئی تھی۔ ان کا سکہ لکھنؤ میں چلا۔ آگے چل کر لکھنؤ میں میدان آتش اور ناسخ کے اور پھر مرثیہ گوئی میں انیس اور دبیر کے ہاتھ رہا۔ ان میں اول الذکر میر خلیق کے فرزند اور دوسرے میر ضمیر کے شاگرد تھے۔ میر حسن اور کچھ دوسروں نے اعلیٰ درجے کی مثنویاں لکھیں لیکن ایسی بھی تخلیق ہوئیں جو مضمون اور ادائیگی دونوں لحاظ سے پست قسم کی تھیں اور بعض اساتذہ نے ان میں سے کچھ کو مجموعہ اغلاط قرار دیا۔ ان میں دیا شنکر نسیم کی مقبول عام مثنوی شامل ہے۔ شاہی عہد کے آخری دور سے مثنویوں کے ساتھ ساتھ غزل گوئی بھی پستی کی طرف مائل ہوگئی۔ ایسے شاعر ہوئے جن کے یہاں رعایت لفظی اور دوسرے صنائع کی بھرمار اور محبوب کے سراپا کی جزئیات و تکرار کے سوا کوئی فکر انگیز بات شاذ و نادر ہوتی تھی، حالانکہ اچھے اور خوش فکر شاعر اس دور میں بھی نمودار ہوئے زوال و ابتذال کا یہ سلسلہ آگے کئی دہائیوں تک چلتا رہا حتیٰ کہ شاعر اور محقق ناطق لکھنوی نے ایک طرف اپنے کلام کے ذریعہ اردو شاعری میں خیال اور فن اظہار کے نئے معیار قائم کئے اور دوسری طرف اپنے چند ہم مذاق شاعروں کے ساتھ مل کر لکھنؤ کی شاعری کی سطح بلند کرنے کے لیے جس کو سوقیانہ کہا جانے لگا تھا باقاعدہ تحریک چلائی جس نے وقت کے دھارے کو پلٹ دیا شاعر اور نقاد اور لکھنوی تمدن کے ایک نمائندے مرزا جعفر علی خاں اثر لکھنوی کے الفاظ تھے کہ ''بلا خوف تردید کہتا ہوں کہ جدید اردو غزل گوئی کا سنگ بنیاد حضرت ناطق نے رکھا'' ان دونوں کے علاوہ صفی لکھنوی، عزیز لکھنوی، محشر لکھنوی، نوبت رائے نظر لکھنوی وغیرہ پر مشتمل اس حلقہ فکر نے جس کو سبعہ سیارہ کہا جاتا تھا اردو شاعری میں ایک انقلاب کی شروعات کی۔ انہوں نے اپنے شاگردوں کے علاوہ دوسرے اساتذہ کو بھی فکر سخن کی مروجہ روش ترک کر کے نئی راہ اختیار کرنے پر آمادہ کیا۔ اس دور کے رسالہ معیار

کے صفحات ان کی مہم کی نشاندہی کرتے ہیں۔

حکیم الوالعلا ناطق لکھنوی نے دوسری چیزوں کے علاوہ شاعری میں دو بنیادی نظریات پیش کر کے ان کو آگے بڑھایا۔ ایک یہ کہ جہاں تک ہو سکے ''محبوب کے ظاہری حسن اور سراپا کے بجائے شاعر کے واردات قلب (یعنی عاشق کے دل پر جو گذرتی ہے) اس کی تصویر کشی کی جائے''۔ اس طرح تصوف کے لیے بھی وسیع میدان نکل گیا۔ دوسرے یہ کہ شعر ایسے ہوں جو آپ صرف مشاعروں اور محفلوں میں نہیں بلکہ اپنے گھر میں سب کے سامنے پڑھ سکیں۔ پاکستان کے نقاد و ادیب سید رشید احمد نے لکھا کہ ''فرسودہ اور معاصرانہ روایتی رنگ کے خلاف سب سے پہلے اور سب سے منظم اعلان جنگ'' کی حیثیت رکھنے والی ''تحریک سبعہ سیارہ اور اس کے قائد ناطق لکھنوی کو اردو غزل کے مؤرخوں اور ناقدوں نے غزل کے ارتقاء کی تاریخ میں یکسر نظر انداز کر دیا اور اس طرح اردو ادب کی تاریخ میں ایک نمایاں شگاف چھوڑ دیا'' غزل اور اس کی نشو ونماء کی تاریخ سے اس اہم باب کو حذف کئے جانے کی ستم ظریفی کو یہ حقیقت اور زیادہ نمایاں کر دیتی ہے کہ ناطق لکھنوی نے اردو زبان و ادب کی تاریخ اور فلسفۂ تاریخ پر ایک طویل نظم لکھ کر بیسویں صدی کے وسط سے کچھ پہلے دہلی سے کلکتہ اور حیدر آباد تک ایک ہلچل پیدا کر دی تھی۔ مولانا عبداللہ عمادی، ڈاکٹر ذاکر حسین، مولانا عبدالماجد دریابادی، خواجہ حسن نظامی اور حامد اللہ افسر وغیرہ نے اس کتاب ''نظم اردو'' کے دل نشیں پیرائے اور حاشیوں کے کثیر تحقیقی مواد پر حیرت ظاہر کرتے ہوئے اس میں شامل فلسفہ تاریخ کو سراہا اور اس تصنیف کو اردو لسانیات و ادب میں ایک عدیم المثال کارنامہ قرار دیا۔ ''نظم اردو'' میں دہلی، لکھنؤ، دکن اور باقی ملک کے ایک ہزار کے قریب شاعروں، ادیبوں اور عالموں کے بارے میں بیش قیمت معلومات فراہم کی گئیں۔ تفصیلات کی ایک مثال یہ ہے کہ اس میں 69 مثنویوں کے نام، ان کے شاعر اور سن اشاعت ایک ہی جگہ درج کئے گئے ہیں۔

پچھلی صدیوں کے لکھنؤ کے نامور شاعروں میں سابقہ صفحات پر درج مشاہیر کے علاوہ امیر مینائی، آرزو، حسرت، رنگین، اختر (واجد علی شاہ)، اختر (قاضی محمد صادق) عاشق وغیرہ شامل ہیں۔ لکھنؤ کی پانچ مثنویاں زیادہ مشہور یا مستند ہوئیں جو میر حسن، نواب مرزا شوق، دیا شنکر نسیم، واجد علی شاہ اختر

اور قلق لکھنوی نے تخلیق کیں۔

نثری ادب

لکھنؤ میں نثری ادب 19 ویں صدی کے ربع اول ہی میں اپنے عروج پر پہنچ چکا تھا جب مرزا رجب علی بیگ سرور نے فسانہ عجائب تخلیق کی۔ زبان کے لحاظ سے اودھ میں نثر کو بھی اسی سانچے میں ڈھالا گیا جس میں نظم اور عام گفتگو کی زبان ڈھلی تھی۔ زبان کو زیادہ سے زیدہ صاف اور شستہ بنانے کا کام اس کارگاہ میں دن رات جاری رہتا تھا اور اس میں شبہ نہیں کیا جا سکتا کہ جو اردو زبان آج مستعمل ہے وہ لکھنؤ کے اس گہوارے سے نکل کر آئی۔ اودھ کے متوازن مزاج اہل نقد ونظر بھی اس بات کا دعویٰ کرتے ہیں اور لاتعداد الفاظ کی تراش خراش کی مثالیں اس دعوے کے ثبوت میں موجود ہیں کہ متروک الفاظ وقوائد کے اصولوں کے معاملے میں پہل یہاں سے ہوئی۔ مثلاً تک، بل (بغیر)، بعض انداز کی جمع (مؤنث) جیسے آتیاں، جاتیاں وغیرہ۔ یہ الفاظ پہلے پہل اودھ میں ترک کئے گئے اسی طرح نئے ڈھلنے والے الفاظ لکھنؤ اور اودھ سے چل کر پورے ہندوستان میں قبول اور رائج ہوئے۔ مصحفی کے بارے میں کئی ذرائع سے روایت ہے کہ وہ زبان کے امور پر روزانہ اپنے شاگردوں کی کلاس لگا کر تقریر کرتے تھے۔ دوسری کئی سمتوں میں زبان نکھر رہی تھی۔

اودھ والوں کو نثر نگاری کی تحریک اور ترغیب دہلی سے ملی۔ لیکن جلد ہی اپنے معیار اور اثر انگیزی میں دہلی کی ''چار درویش'' اور دوسری تصنیفات سے فسانۂ عجائب، فسانۂ آزاد، نورتن وغیرہ کہیں آگے بڑھ گئیں۔ لکھنؤ میں سرور نے فسانہ عجائب کے علاوہ کئی دوسری نثری تحقیقات منظر عام پر لاکر پورے شمالی ہند میں لوگوں کو حیران کردیا۔ مولوی غلام امام شہید کا میلاد ایک کثیر الاشاعت کتاب تھی۔ علی گڑھ سے تہذیب الاخلاق اور آگرہ سے ''تیرہویں صدی،، کے ساتھ لکھنؤ سے اودھ پنچ شائع ہونے لگا جس کے ایڈیٹر منشی سجاد حسین تھے۔ اودھ اخبار میں رتن ناتھ سرشار کی تحریر اور دلگداز میں عبدالحلیم شرر کی مسلسل تصنیف شائع ہوئی۔ 19 ویں صدی میں اس سے قبل محشر اور دوسرے رسالے جاری ہو چکے تھے اور اسی صدی کے اندر تاریخی ناول بھی شروع ہوئے۔ ظرافتی

شاعری کی طرح ظریفانہ نثر کی بھی شروعات لکھنؤ نے کی۔

نثر نگاری میں داستان گوئی کا اہم مقام ہے۔ پہلے دہلی کے مشہور داستان گو لکھنؤ آئے اور پھر یہاں نئے پیدا ہونے لگے یہاں تک کہ ہر دولت مند شخص کے یہاں ایک داستان گو لازمی ہوگیا۔ بہت سی داستانیں تحریری شکل میں شائع ہوئیں۔ ان کے زیر اثر اور کچھ بیرونی اثرات سے ڈرامہ نگاری نے بھی فروغ پایا پھر امانت کی اندر سبھا پورے ماحول پر چھا گئی۔

دینی مدارس نے بھی آگے چل کر اردو زبان کی پرداخت میں خاصا کردار ادا کیا۔ لکھنؤ میں دو اہم دینی مراکز مملکت اودھ کے وجود سے بہت پہلے سے قائم رہے ہیں --- فرنگی محل اور ٹیلہ شاہ پیر محمد۔ یہ دونوں اورنگ زیب نے قائم کئے تھے اجودھیا سے واپسی میں لکھنؤ میں اپنی آمد کے دوران چوک کے پاس واقع فرنگی محل نامی کوٹھی میں جو قبل ازیں ایک فرانسیسی شخص کی ملکیت تھی جس کی وجہ سے اس کا نام فرنگی محل پڑ گیا تھا اورنگ زیب نے اس کو خرید کر اپنے دور کے ذی مرتبت عالم ملا نظام الدین سہالویؒ کی دینی خدمات حاصل کر کے مدرسہ کھلوایا اس کوٹھی کے ساتھ دوسرے مکانات بھی عالم موصوف کو پیش کئے گئے۔ اسی طرح بادشاہ نے دریائے گومتی کے کنارے بلند ٹیلے پر جس کو لچھمن ٹیلہ کہا جاتا تھا مسجد تعمیر کرائی اور جونپور کے عالم وصوفی شیخ پیر محمدؒ کو مسجد و مدرسہ کی ذمہ داری کے لئے دعوت دی۔ شیخ پیر محمدؒ کا مزار بھی مسجد کے شمال مشرق میں ہے۔ ان کی تعلیمات وافکار نے دور دور تک شہرت پھیلائی اور متعدد ارادت مندوں پر اپنی تعلیم اور حسن سلوک کا اثر چھوڑا۔ شیخ پیر محمدؒ نے کئی کتابیں تحریر کیں۔ ان کے مخطوطات رضا لائبریری رام پور میں موجود ہیں (؟) بعد کے دور میں مدارس میں اردو زبان اور خطابت باقاعدہ نصاب میں شامل کی گئی اس طرح دینی مراکز اردو زبان کے پھیلاؤ اور اس کی تراش خراش میں حصہ دار بن گئے۔

✿✿✿

ڈاکٹر عقیل احمد

اول المحمدین۔۔۔۔۔۔۔۔۔خواجہ میر درد

خواجہ میر درد کا سلسلۂ پدری گیارہ واسطوں سے خواجہ بہاؤ الدین نقش بند سے اور پچیس واسطوں سے حضرت امام عسکری سے ملتا ہے۔ سلسلہ کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ یہ سلسلہ حضرت غوث الاعظم محی الدین شیخ عبدالقادر جیلانی تک پہنچتا ہے۔ اورنگ زیب کے زمانے میں ان کے جد خواجہ محمد طاہر نقشبند بخارا سے ہندوستان آئے۔ ان کے والد خواجہ محمد ناصر عندلیب تھے۔ ان کے آباواجداد و نواب ظفر اللہ خاں اور ان کے والد نواب فتح اللہ خاں اپنے عہد کے امرا میں سے تھے لیکن ناصر کی طبیعت میں درویشی اور قلندری تھی خواجہ محمد زبیر کے حلقہ ارادت میں شامل ہو گئے تھے خواجہ محمد زبیر نقش بندیؒ کے فیضان صحبت نے محمد ناصر عندلیب کو روحانی اعتبار سے اعلیٰ مقام پر پہنچا دیا تھا اور انھوں نے تصوف میں محمدیہ کے نام سے ایک نئے سلسلہ کی بنا ڈالی۔ اس لیے انھیں امیر المحمدین اور خواجہ میر درد کو اول المحمدین کہا جاتا ہے۔ اسے کشف طریق محمدی بھی کہا جاتا ہے

کشف طریق محمدی: اس کشف ظہور کے بارے میں روایت ہے کہ خواجہ محمد ناصر مسلسل سات روز اپنے حجرے میں گوشہ نشین رہے۔ خواجہ میر درد اپنے والد کی یہ کیفیت دیکھ کر فکر مند رہتے۔ آٹھویں روز خواجہ میر درد کے والد حجرے سے باہر نکلے اپنے بیٹے کو مغموم دیکھ کر سینے سے لگا لیا پھر اسے سات شب و روز استغراق کے دوران اللہ کے ذریعے نوازے گئے شرف سے مطلع کیا۔ حضرت امام حسنؓ کے نزول اور طریق محمدی کے مژدے کی اطلاع دی۔ اور اپنے فرزند خواجہ میر درد کو اس مسلک میں اپنا پہلا مرید بنایا اسی لیے خواجہ میر درد اول المحمدین کہلائے اور خواجہ ناصر امیر المحمدین۔

خواجہ میر درد کا انتقال 1199ھ میں ایک روایت کے مطابق 66 سال کی عمر اور دوسری

روایت کے مطابق 68 سال کی عمر میں ہوا۔ لیکن خواجہ میر درد کی تحریروں سے ثابت ہے کہ ان کی پیدائش 1133ھ میں ہوئی۔ انھوں نے جملہ علوم رسمیہ اپنے والد ماجد سے پڑھے اور فارسی سراج الدین خاں آرزو سے سیکھی۔ انھیں علوم شرعیہ میں مہارت حاصل تھی۔ علوم القرآن، تفسیر حدیث، فقہ اصول، تصوف اور سلوک میں انھیں مہارت حاصل تھی۔ تصوف میں ان کا سلسلہ نقشبندی تھا جس میں سماع کا سننا ممنوع سمجھا جاتا ہے لیکن میر درد کو سماع سے خاص یگانگت تھی موسیقی کے فن سے وہ پوری واقفیت رکھتے تھے۔ انھیں موسیقی اور شاعری سے دلچسپی شاہ سعد اللہ کی شاعری اور موسیقی سے ہوئی۔ درد اپنے زمانے کے موسیقی کے بڑے استاد مانے جاتے تھے۔ بڑے بڑے قوال اور فن کاران کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔ نامۂ درد میں کہتے ہیں:

> ''میرا سماع من جانب اللہ ہے اور اللہ تعالیٰ اس بات پر ہر وقت گواہ ہے کہ گانے والے خود بخود آتے ہیں اور ہمیشہ جب تک چاہتے ہیں گاتے ہیں نہ یہ کہ فقیر ان کو بلاتا ہے اور گانا سننا دوسروں کی طرح عبادت سمجھتا ہے، بلکہ نہ انکار کرتا ہے نہ یہ کام کرتا ہے جس کا ذکر کیا اور عقیدہ وہی ہے جو میرے بزرگوں کا عقیدہ ہے''

ہر مہینے کی دوسری اور چوبیسویں تاریخ کو خواجہ میر درد کے یہاں محفل سمع کا انعقاد ہوا کرتا تھا جس میں اس عہد کے نامور فضلا اور مشائخ کبار اور امراء عظام شریک ہونا سعادت سمجھتے تھے۔ شہنشاہ وقت شاہ عالم ثانی بھی آیا کرتے تھے ایک بار کا ذکر ہے کہ شاہ عالم کے پاؤں میں درد تھا۔ شدت تکلیف سے وہ ضبط نہ کر سکے اور تھوڑا سا پاؤں پھیلا دیا۔ خواجہ میر درد کی بوریا نشینی نے شہنشاہ کی اس حرکت کو اپنے آداب محفل کے خلاف سمجھا اور فرمایا یہ امر فقیر کے آداب محفل کے خلاف ہے۔ بادشاہ نے عذر کیا اور معافی مانگی خواجہ صاحب نے فرمایا کہ اگر طبیعت خراب تھی تو تکلیف کرنے کی کیا ضرورت تھی اس سے خواجہ صاحب کے مقام استغنیٰ کا اندازہ فرمایئے۔

خواجہ میر درد 39 سال کی عمر میں سجادہ نشین ہوئے۔ ان کے آبا واجداد دہلی کے امرا میں سے تھے لیکن ان کے والد سب کچھ چھوڑ کر درویشی اختیار کی تھی اور اپنے والد کی ایما پر درد نے بھی پہلے

ملازمت سے سبکدوش ہوئے پھر جاگیر چھوڑی دنیا کی نعمتوں سے کنارہ کش ہوئے۔ دورویش گوشہ نشین ہوگئے فاقہ کشی کی نوبت آگئی ان کے صاحبزادے ناصر نذیر فراق میخانہ درد میں ڈیڑھ فاقوں کے بارے میں لکھتے ہیں:

''حضرت درد نے ساری عمر فاقوں میں بسر کی اور آپ کے گھر کا ڈیڑھ فاقہ مشہور ہوگیا۔ ایک فاقہ اکیس رت اور اکیس دن کا ہوا اور آپ کے محل کی لونڈیوں نے بھی اکیس رات دن کچھ نہ کھایا پیا اور آدھا فاقہ اٹھاراہ دن کا۔ آپ نے اور آپ کے اہل بیت نے اور آپ کی لونڈیوں نے بھی اٹھارہ دن تک کچھ نہ کھایا پیا۔ کیوں کہ اس مدت میں کھانے پینے کا کوئی بندوبست ہی نہیں ہوا۔''

خواجہ میر درد کے دیوان میں سب سے زیادہ غزلیں می اور ا کی ہیں ۔ ماہرین موسیقی بتاتے ہیںvovel ردیفیا قافییکی غزلیں موسیقی کے لیے زیادہ موزوں ہوتی ہیں۔ان سے غنائیت پیدا ہوتی ہے۔شمس العلما مولوی سید امام اثر'' کاشف الحقائق'' میں درد کی شاعری کے بارے میں لکھتے ہیں:

''خواجہ صاحب کی غزل سرائی نہایت اعلی درجے کی ہے۔سوز و گداز میں ان کا جواب یا میر تھے یا آپ اپنے آپ جواب تھے۔''

المختصر غزل سرائی کے اعتبار سے خواجہصاحب ایک بڑے شاعر تھے اور ان کا نظیر سوائے میر کے کوئی دوسرا نہیں دیکھا جاتا ہے۔۔۔ سبحان اللہ کیا غزل سرائی ہے کن کن باتوں کی تعریف کی جائے۔۔۔ واقعی خواجہ صاحب کی غزل الہامی شاعری کا نمونہ ہے۔ علاوہ سوز و گداز وغیرہ کے ان کے کلام میں نفاست، متانت، شیرینی، حلاوت رنگینی بھی کس قدر پیدا ہے اور شوخی کس درجہ آشکارا ہے۔نمونے کے طور پر ان کی ایک مشہور غزل کے اشعار

دل مرا پھر دکھا دیا کس نے
سوگیا تھا جگا دیا کس نے
میں کہاں اور خیال بوسہ کہاں

منھ سے منھ بھڑا دیا کس نے
وہ مرے چاہنے کو کیا جانے
یہ سندیسا سنادیا کس نے
ہم بھی کچھ دیکھتے سمجھتے تھے
سب یکایک چھپا دیا کس نے
وہ بلائے سے بھاگتا تھا اور
درد تجھ تک بلا دیا کس نے

ایک غزل کے چند اشعار

ترے کہنے سے میں ازبس کہ باہر ہو نہیں سکتا
ارادہ صبر کا کرتا تو ہوں پر ہو نہیں سکتا
کہا جب میں ترا بوسہ تو جیسے قند ہے پیارے
لگا تب کہنے پر قند مکرر ہو نہیں سکتا
دل آوارہ الجھے یاں کسو کی زلف سے یا رب
علاج آوارگی کا اس سے بہتر ہو نہیں سکتا

دوسری غزل

تو کب تئیں مجھ ساتھ مری جان ملے گا — ایسا بھی کبھو ہوگا کہ پھر آن ملے گا
چلیے کہیں اس جا پہ کہ تم ہوں اکیلے — گوشہ نہ لے گا کوئی میدان ملے گا
نزدیک ہے پر اپنے بلانے سے کب آوے گا — مل جائے گا تو دور سے پہچان ملے گا
یوں وعدے سے ترے دل کی تسلی نہیں کرتے — تسکین تبھی ہووے گی تو جس آن ملے گا
اے درد کہا میں نے ملو جس سے کہ چاہو — کہنے لگا تجھ سا کوئی انسان ملے گا

ان اشعار کی سب سے خاص بات سادگی اور تازگی ہے اشعار دو سو سال پہلے لکھے گئے ہیں

لیکن ان میں کوئی لفظ ایسا نظر نہیں آرہا ہے کہ اس کے لیے لغت کا سہارا لیا جائے۔ ان اشعار میں شوخی بھی رنگینی بھی اور سرمستی بھی، مثالیں اور بھی دی جا سکتی ہیں۔

خواجہ میر درد کی شاعری کا خاص وصف تصوف ہے۔ متصوفانہ شاعری ہی ان کی شاعری کی جان ہے۔ ان کے زمانے میں وحدت الوجود اور وحدۃ الشہود کی بحث جاری تھی۔ درد نے اسے انسانی دوستی کا ذریعہ بنایا جس میں انسانی حقوق کی اہمیت اور انسان کے بلند مرتبے پر خاص توجہ دی گئی ہے۔ وہ کہتے ہیں۔

بیگانہ گر نظر پڑے تو آشنا کو دیکھ
بندہ گر آوے سامنے تو بھی خدا کو دیکھ
اے درد جہاں کہیں میں دیکھا
وہ یار ہی مرا جلوہ گر تھا

یا ان کی وہ مشہور غزل

جگ میں آکر ادھر ادھر دیکھا
تو ہی آیا نظر جدھر دیکھا

یا

دونوں جہاں کو روشن کرتا ہے نور تیرا
اعیان میں مظاہر ظاہر ظہور تیرا

وحدت الوجودی فلسفہ عبد اور معبود کو الگ نہیں کرتا جب کہ شہودی فلسفہ عبد اور معبود کی حد کو قائم رکھتا ہے۔ پہلے شعر میں درد کو اللہ کا ظہور چاروں طرف نظر آتا ہے دوسرے شعر میں دونوں جہان کو روشن کرنے والا اللہ کا نور ہے اور آنکھوں میں اسی کے مظاہر کا ظہور ہے۔ وحدت الوجود اور وحدت الشہود کی لمبی بحث ہے میر درد نے اپنی کتاب علم الکتاب میں لکھا ہے کہ:

''یہ اصطلاح صوفیہ کی انشراح کی ہوئی ہے اور حضور پر نور کے زمانے میں ان کا کوئی ذکر نہ تھا اس طرح سے توحید وجودی و توحید شہودی دو جدا جدا امر نہیں تھے اس وقت کبھی توحید مطلق کے ان جزئیات سے بحث نہیں کی گئی۔ بیان توحید میں وجودیت شہودیت کی یہ قیود بعد میں لگائی گئیں۔ توحید کا مطلب وہی تھا جو حضرت رسالت پناہ اپنے اصحاب سے فرماتے تھے کوئی اور امر دینی میں خلل نہیں دے سکتا تھا۔حرف سننا یقین کرنے کے لیے کافی تھا۔۔۔لیکن جب رسول اللہ ﷺ کو بہت زمانہ گزر گیا تو ایمانوں میں کمزوری اور دلوں میں شبہات پیدا ہونے لگے۔

اس وقت بعض مومنین عقلا نے جو استعداد حکیمانہ رکھتے تھے جو اپنی قوت فکر سے سمجھتے آیت و احادیث سے اس کا استنباط کرتے وہ اپنے اس بیان کو معارف کہنے لگے اور توحید مطلق کے اسی مطلب کو توحید وجودی سے مقید کردیا۔ یہ قائل وحدت وجود ہوگئے اور ان مسائل کی تفصیل کو علم تصوف کا نام دیا۔''

خواجہ میر درد صوفیاے وحدت الوجود کے ان خیالات سے متفق نہ تھے جو وحدت الوجود کے نام پر ترک شریعت کرتے ہیں۔ وحدت الوجود کے بارے میں ان کا خیال ہے کہ موجود بالذات صرف وہی ہے وہ اس بات سے متفق نہیں کہ عبد اور معبود عین ہیں۔وہ مانتے تھے کہ وحدت الوجود اور وحدت الشہود کا مقصد قلب کا ماسوا سے آزاد کرنا ہے۔ یہ سب اسی ایک شہر علم محمدی کے کوچے ہیں اور اسی بحر ذخار کی موجیں اور نہریں ہیں۔

یاں اختصار کا تو امکاں سب ہوا ہے
ہم ہوں نہ ہوں ولے ہے ہونا ضرور تیرا

باہر نہ آسکی تو قید خودی سے اپنی
اے عقل بے حقیقت دیکھا شعور تیرا

ہے جلوہ گاہ تیرا کیا غیب، کیا شہادت
یاں بھی شہود تیرا، واں بھی حضور تیرا

مدرسہ یا دیر تھا یا کعبہ یا بت خانہ تھا
ہم سبھی مہمان تھے واں ہی صاحب خانہ تھا

ہوگیا سرائے کثرت موہوم آہ
وہ دل خالی کہ تیرا خاص خلوت خانہ تھا

مجھے در سے اپنے لوٹاے ہے یہ بتا مجھے تو کہاں نہیں
کوئی اور بھی ہے ترے سوا تو اگر نہیں تو جہاں نہیں

کائنات کی بے ثباتی

مٹ جائیں ایک آن میں کثرت نمایاں
ہم آئینے کے سامنے جب آکے ہوکریں

نہ گل کو ہے ثبات نہ ہم کو ہے اعتبار
کس بات پر چمن ہوس رنگ و بو کریں

تر دامنی پہ شیخ ہماری نہ جائیو!
دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں

یہ تصوف میں درد کا مقام ہے۔ اٹھارویں صدی کے شعرا کے تصوف کے اشعار سبھی کے یہاں ملتے ہیں لیکن درد کا کلام اور زندگی تصوف سے پر ہے۔ ان کی زندگی بھی اور ان کی شاعری بھی تصوف کا نمونہ ہے۔

❁❁❁

کتابوں کی باتیں

کتاب کا نام: اردو کی اہم خواتین افسانہ نگار (صوبہ بہار کے حوالے سے)

مصنفہ : ڈاکٹر رخسانہ جمیل

ناشر : ایم آر پبلی کیشنز، نئی دہلی

مبصر : ڈاکٹر عقیل احمد

خواتین کے افسانوں پر کام کرنے کی کامیاب کوشش ہے۔ صوبۂ بہار سے بڑھا کر رخسانہ جمیل اپنے مطالعے کو قومی سطح پر وسعت دے سکتی تھیں۔ اس سے ان کے کام کی افادیت بڑھ جاتی۔ خواتین کی تحقیقات پر کم لکھا گیا ہے اس نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو رخسانہ جمیل کا کام قابل قدر ہے۔ بہار کے ابتدائی خواتین افسانہ نگار سے لے کر 2000 تک کی خواتین افسانہ نگاروں کا ذکر کیا گیا ہے۔ ان میں کچھ ذکیہ مشہدی، شمیم صادق اعجاز شاہین تسنیم کوثر جیسی مشہور معروف افسانہ نگار بھی ہیں اور کچھ ایسی بھی خواتین ہیں جنھیں رخسانہ جمیل نے اپنے مطالعے کا حصہ بنا کر ان کو متعارف کرانے کا نیک کام کیا ہے کتاب کے چار ابواب پر مشتمل ہے خاص حصہ باب اول ہے جس میں بہار کی خواتین افسانہ نگاروں کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ اس 28 خواتین افسانہ نگاروں کی تخلیقات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ دوسرے باب میں بہار کی خواتین کے اردو افسانے جھارکھنڈ کی تشکیل کے بعد کا جائزہ لیا گیا ہے تیسرے گوشے میں افسانوں کے مضامین اور موضات پر بحث کی گئی اور چوتھے میں افسانوں کی زبان اور اسلوب کا مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ آخر میں ماحصل اور کتابیات کا گوشہ ہے۔ ماحصل میں اس حقیقت کواجاگر کیا ہے کہ بہار میں افسانہ نگاری کا ارتقا چوتھی دہائی سے ہوا ہے اور اس کا آغاز شکیلہ اختر نے کیا۔ 1960 کے بعد اس مین خاطر خواہ اضافہ ہوا۔ مصنفہ نے آخر میں مختصراً سبھی خواتین افسانہ نگاروں کی تخلیقات کا تعارف پیش کیا ہے۔ موضوع اور مواد دونوں اعتبار سے یہ ایک اہم کتاب ہے۔ اس سے دوسرے علاقوں کی خواتین افسانہ نگاروں پر کام کرنے کا سلسلہ شروع ہوگا۔

✡✡✡

غالب اکیڈمی کی ادبی سرگرمیاں

غالب اکیڈمی ایک ادبی نشست کا اہتمام کرتی ہے جس میں ادیب و شاعر شرکت کرتے ہیں اور اپنی نثری اور منظوم تخلیقات پیش کرتے ہیں۔

غالب اکیڈمی میں ادبی نشست

11 مئی 2013 کو شام ساڑھے پانچ بجے غالب اکیڈمی، بستی حضرت نظام الدین، نئی دہلی میں ایک ادبی نشست کا اہتمام کیا گیا۔ جس میں ممبئی کے شمیم طارق، ریاض قدوائی، متین امروہوی، نسیم عباسی، چشمہ فاروقی، ،نگار عظیم، انجم عثمانی، قیصر عزیز وغیر نے شرکت فرمائی۔

25 رمئی 2014 غالب اکیڈمی میں ادبی نشست

غالب اکیڈمی، بستی حضرت نظام الدین، نئی دہلی میں 25 مئی 2013 کو شام پانچ بجے ایک ادبی نشست کا اہتمام کیا گیا۔ جس میں ممبئی سے تشریف لائے شمیم طارق، انجم عثمانی، سکندر عاقل، شہباز ندیم ضیائی، چشمہ فاروقی، قیصر عزیز، متین امروہوی نسیم عباسی، اسرار جامعی ، کمال جعفری، احمد علی برقی نے شرکت کی۔

غالب اکیڈمی میں ادبی نشست

بروز ہفتہ 8رجون 2013 کو شام ساڑھے پانچ بجے غالب اکیڈمی، نئی دہلی میں ایک ادبی نشست کا اہتمام کیا گیا جس میں نسیم عباسی، ریاض قدوائی، متین امروہوی، فاروق ارگلی، خلیل احمد، شہباز ندیم ضیائی، احمد علی برقی، انجم عثمانی، سکندر عاقل، قیصر عزیز نے شرکت کی اور اپنا اپنا کلام پیش کیا۔

ادبی نشست میں کراچی سے آئے مہمانوں کا خیر مقدم

4رستمبر 2013 گزشتہ روز غالب اکیڈمی نئی دہلی میں ایک ادبی نشست کا اہتمام کیا گیا جس میں کراچی کی مشہور افسانہ نگار رئیس فاطمہ اور قاضی اختر جونا گڑھی نے شرکت کی۔ نشست کی

صدارت مشہور افسانہ نگار ترنم ریاض نے کی۔ اس موقع پر رئیس فاطمہ نے اپنی ایک کہانی سنائی اور قرۃ العین حیدر کے فن پر بولتے ہوئے کہا کہ ''قرۃ العین حیدر نے آگ کا دریا میں شعور کی رو کی تکنیک پہلی بار اپنائی۔ وہ جب پاکستان آئیں تو پی آئی اے میں انھوں نے خواتین کے لیے راہ ہموار کی، لیکن جلد ہی انھوں نے ہندوستان واپسی کا ارادہ کرلیا۔'' اس موقع پر موجود شعرا نے اپنے کلام سے نوازا۔ منتخب اشعار پیش خدمت ہیں:

یہ ترکِ تعلق کا نتیجہ ہے کہ جس سے	اب شوقِ ملاقات ادھر بھی ہے ادھر بھی	احمد علی برقی
اس سلیقے سے وہ چلتا ہے کہ ٹھوکر نہ لگے	ہے تو نابینا مگر اہلِ نظر جیسا ہے	خوشتر رحمانی
راستے آسان ہوتے ہی گئے	ہاں سفر کا ذائقہ جاتا رہا	حیدر علوی
محبت ہوں اہلِ دل کے لیے	اور دنیا کی ہر زبان میں ہوں	سویتا اسیم
بہت اچھی سہی لیکن یہ کوشش سوچ کر کرنا	کسی کی نیند پر خوابوں کی بارش سوچ کر کرنا	سکندر عاقل
زندگی آساں نہیں ہے مشکلوں کے درمیاں	آدمی تنہا بہت ہے دوسروں کے درمیاں	قاضی اختر
ہاں وہی مانگا ہے میں نے جو ترے بس میں نہیں	زندگی اور ذرا دیر کی مہلت دے دے	ایس یو ظفر
اڑ گئی نیند آنکھوں سے کہہ کر	یہ علاقہ ہمارا نہیں ہے	آنا دہلوی
کچھ دیر کو تو ان کا بھی چہرہ اتر گیا	اتنا تو اعتبار میری چشمِ تر کا ہے	ظہیر برنی
کبھی مسجد، کبھی میخانہ، کبھی ویرانہ	دلِ برباد بھی ڈھونڈے ہے ٹھکانے کیا کیا	نسیم عباسی
آنکھوں سے کہے کوئی، آنکھوں سے سنے کوئی	اس طرزِ تکلم کو کہتے ہیں غزل گوئی	متین امروہوی

اس موقع پر افضل منگلوری اور شہباز ندیم ضیائی نے بھی اپنے اشعار پیش کیے۔ شادات تبسم نے اکبر آلہ ابادی کے خطوط نگاری پر ایک مضمون پیش کیا۔ محترمہ ترنم ریاض نے اپنی ایک نظم سنائی اور شرکا کا شکریہ ادا کیا۔

✿✿✿

غالب اکیڈمی کے استقبالیہ جلسے میں غیر ملکی مہمانوں کا اظہار خیال

10 ستمبر 2013 کو غالب اکیڈمی، نئی دہلی میں غیر ملکی مہمانوں کے اعزاز میں ایک استقبالیہ جلسے کا اہتمام کیا گیا۔ جس میں روس کی مہمان ڈاکٹر لدمیلا واسیلو ا اور پاکستان کے مہمان پروفیسر

تحسین فراقی نے شرکت کی اس موقع پر پروفیسر شمیم حنفی نے مہمانوں کا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ ڈاکٹر لدمیلا واسئیلو انسٹی ٹیوٹ آف اورینٹل اسٹڈیز کے لٹریچر ڈپارٹمنٹ سے وابستہ ہیں۔ اردو کے فروغ کے لیے روس میں سرگرم ہیں کئی کتابوں کا ترجمہ روسی سے اردو میں اور اردو سے روسی میں کیا۔ فیض اور حالی پر ان کا بہت اہم کام ہے۔ پروفیسر شمیم حنفی نے کہا کہ پروفیسر تحسین فراقی مجلس ترقی ادب لاہور کے ڈائرکٹر ہیں خود کلاسیکی ادب سے گہری دلچسپی رکھتے ہیں۔ پنجاب یونیورسٹی کے شعبۂ اردو اور علامہ اقبال انسٹی ٹیوٹ سے وابستہ رہے ہیں۔ اس موقع پر ڈاکٹر لدمیلا واسئیلو انے روس میں اردو کی صورتحال پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ روس میں اردو تاریخ سو سال سے بھی زیادہ پرانی ہے۔ روس میں اردو کے فروغ میں نشیب وفراز آتے رہے ہیں۔ سویت یونین کے دور میں اردو کو سب سے زیادہ فروغ ملا۔ دو اشاعت گھر صرف اردو کی کتابیں شائع کرتے تھے جو اب بند ہو گئے۔ ترجمے کا کام بہت زیادہ ہوتا تھا۔ اردو ادب پڑھنے والوں کی تعداد بہت زیادہ تھی ریڈیو نشریات کے اوقات بھی بہت زیادہ تھے یہ سب سویت یونین کے خاتمے کے ساتھ بند ہو گئے۔ لیکن اب نئے روس میں اردو کا فروغ پھر شروع ہوا۔ ماسکو اور پیٹرس برگ کی تین یونیورسٹیوں میں اردو بحیثیت غیر ملکی زبان پڑھائی جاتی ہے۔ طلبا میں اردو تعلیم کی طرف رجحان بڑھ رہا ہے آج کل دو طالبہ جامعہ اسلامیہ سے ایم اے اردو کر رہی ہیں۔ ایف ایم پر اردو نشریات جلد جاری ہوں گی۔ اردو ادب کا ترجمہ جتنا روسی زبان میں ہوا ہے کسی اور زبان میں نہیں ہوا۔ اس موقع پر پروفیسر تحسین فراقی نے پاکستان میں اردو کی صورتحال پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ پاکستان میں اردو کا فروغ بہت تیزی سے ہو رہا ہے اردو تعلیم کا بہتر بندوبست ہے پورے پاکستان میں اردو لکھنے پڑھنے بولنے والے موجود ہیں انھوں نے مجلس ترقی ادب کے بارے میں بتایا کہ اس کی تشکیل 1950 میں ہوئی تھی اس ادارے نے ایک لاکھ سے زیادہ صفحات کے تراجم غیر ملکی زبانوں سے اردو میں کرائے۔ عربی ادب کا بہت سا حصہ اردو میں منتقل کیا گیا تراجم تہذیبوں کے مابین پل کا کام کرتے ہیں۔ علامہ اقبال پر وہاں خصوصی توجہ دی جا رہی ہے رفتہ رفتہ ان کی تمام باقیات کو محفوظ کیا جا رہا ہے جلد ہی علامہ کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ساری چیزیں سامنے آجائیں گی۔ جلسے کی صدارت

جناب شاہد علی خاں نے کی۔ اس موقع دہلی اردو اکادمی کے اردو سرٹیفکیٹ کورس کے طلبا کو پروفیسر عبد الحق نے کتابیں تقسیم کیں۔ اس موقع پر افضل منگلوری اور متین امروہوی نے اپنا کلام پیش کیا۔

ہمدرد نیشنل فاؤنڈیشن کے ڈاکٹر عزیز احمد صدیقی نے مہمانوں اور تمام حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔ اس موقع پر دہلی یونیورسٹی، جامعہ ملیہ اسلامیہ، جواہر لال نہرو کے طلبہ واساتذہ کثیر تعداد میں موجود تھے جن میں جاوید نسیم، پروفیسر معین الدین جینا بڑے، پروفیسر ارتضیٰ کریم، ڈاکٹر احمد محفوظ، صبا حنفی، انتظار نعیم، سنجیو صراف، ظہیر برنی، ڈاکٹر عبد الرشید، ڈاکٹر شہاب الدین، نسیم عباسی، علیم الدین اسعدی، عبد الرحمٰن، فرحت احساس، اسرار جامعی، محمد خلیل، فضل بن اخلاق کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔

❁❁❁

ثاقب عمران کی مرتبہ کتاب نثار احمد فاروقی پر مذاکرہ

11 ستمبر 2013 نثار احمد فاروقی ایک شخص نہیں بلکہ ایک عہد کا نام ہے اپنے آپ میں ایک انجمن کی حیثیت رکھنے والا یہ ادیب اپنے مزاج کی تندی وتیزی کے باوجود خاص وعام میں مقبول تھا عہد حاضر کے دو نامور نقاد گوپی چند نارنگ اور نثار احمد فاروقی کے خطوط اس بات پر شاہد ہیں۔ انہوں نے اپنے عہد کے نامور ادیبوں کو فیض پہنچایا۔ ان خیالات کا اظہار آج غالب اکیڈمی بستی حضرت نظام الدین میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ریسرچ اسکالر ثاقب عمار کی مرتبہ کتاب ''نثار احمد فاروقی'' پر مذاکرہ کے دوران صدر مجلس پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے کی۔ انہوں نے ان سے اپنی دیرینہ روابط اور مراسم کا ذکر کرتے ہوئے انہیں خراج تحسین پیش کیا۔ نظامت کے فرائض انجام دیتے ہوئے ڈاکٹر سرور الہدیٰ نے کہا کہ آج زمانے کو پھر سے ایک نثار احمد فاروقی کی ضرورت ہے۔ کیونکہ برصغیر میں ان کی علمیت کا اعتراف سبھی کو ہے۔ انہوں نے کہا کہ پروفیسر گوپی چند نارنگ نے ایک بار کہا تھا کہ نثار احمد فاروقی کو جو ذہن ملا تھا اسے وہ صرف آدھا ہی استعمال کر سکے۔ ناظم مجلس ڈاکٹر سرور الہدیٰ کے مختصر خطبے کے بعد کتاب کی رونمائی کی گئی۔ کتاب کو مرتب کرنے والے ثاقب عمران نے نثار احمد فاروقی کے ذریعہ لکھے گئے چند اقتباسات پیش کئے۔ بزم جامعہ کے ریسرچ اسکالر نوشاد منظر اور محمد مقیم نے بھی چند اقتباسات پیش کئے۔ ڈاکٹر مولا بخش

نے کہا کہ نثار احمد فاروقی کو میں نے اپنی ضرورت کے مطابق جانا، خصوصاً تصوف کے حوالے سے میں نے ان سے بہت کچھ سیکھا۔ غالب کی آپ بیتی کو خطوط کے ذریعہ مرتب کرنا ان کے منفرد ذہن کی عکاسی کرتا ہے۔ ان پر گفتگو کرنا دن کو رات اور رات کو دن کرنا ہے۔ ڈاکٹر مولا بخش نے ثاقب عمران کی کوششوں کو سراہا اور انہیں مبارکباد پیش کی۔ شعبۂ عربی جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ڈاکٹر فوزان احمد نے کتاب کی اہمیت کو واضح کرتے ہوئے کہا کہ عربی، اردو اور فارسی کے نامور ادیبوں کے مضامین جو اس کتاب میں موجود ہیں وہ تین نسلوں کے اسکالر کی نمائندگی کررہی ہیں۔ الٰہ آباد یونیورسٹی سے تشریف لائے ڈاکٹر حسین اختر نے خواجہ حسن ثانی نظامی کے مضمون کا ایک اقتباس پیش کیا اور یہ بتایا کہ وہ پہلے ایسے اسکالر ہیں، جنہوں نے فاروقی صاحب کی ماتحتی میں پی ایچ ڈی کیا۔ شریف حسین قاسمی نے فاروقی صاحب سے اپنے جذباتی تعلق کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ وہ اخیر میں عالم نہیں ہوئے، بلکہ وہ عالم پیدا ہوئے تھے۔ اس کے علاوہ تابش مہدی، پروفیسر شہپر رسول، پروفیسر شہناز انجم نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ شرکاء میں نثار احمد فاروقی کے بڑے بیٹے نجم الہادی فاروقی، جامعہ ملیہ کے استاذ ڈاکٹر خالد مبشر کے علاوہ ریسرچ اسکالر اور دیگر حضرات موجود تھے۔ ثاقب عمران نے اخیر میں بزم میں شریک تمام لوگوں کا شکریہ ادا کیا اور اپنی کم مائیگی کا اعتراف کرتے ہوئے نثار احمد فاروقی کو خراج عقیدت پیش کیا۔

✿✿✿

وِدّیا ساگر آنند کے انتقال پر ملال پر اظہار تعزیت

27 ستمبر 2013 کو لندن میں اردو کے معروف ادیب و شاعر ڈاکٹر وِدّیا ساگر آنند کا انتقال ہو گیا۔ غالب اکیڈمی، نئی دہلی میں ایک تعزیتی جلسے میں ان کے انتقال پر ملال پر رنج وغم کا افسوس کرتے ہوئے پریم گوپال متل نے کہا کہ وہ غیر جانب دار مفکر اور مشترکہ تہذیب کے علمبردار تھے۔ یوروپ میں انھیں نمایاں حیثیت حاصل تھی۔ انھوں نے پچاس سے زیادہ شعری ونثری تصانیف تحریر کیں۔ ان کی شاعری کے سات دیوان شائع ہو چکے ہیں۔ وہ اردو کے سچے شیدائی اور سیکولر ذہن کے مالک تھے۔ اس موقع پر ریاض قدوائی نے ان کی کتاب آزادی کے اولین مجاہدین اور بہادر شاہ ظفر کے حوالے سے کہا کہ ڈاکٹر ودیا ساگر آنند بہادر شاہ ظفر کی قبر کو ہندوستان لانے کی تحریک میں

پیش پیش تھے ان کے انتقال سے اس تحریک کو زبردست نقصان پہنچا ہے۔ انھوں نے باقاعدہ مہم چلائی ہندوستان کی حکومت سے خط و کتابت کی۔ پنڈت جواہر لال نہرو اور مولانا آزاد کے موقف کے حوالے دیے۔ اس موقع پر نسیم عباسی نے کہا کہ ودیا ساگر کی شاعری منفرد تھی وہ نظموں کے شاعر تھے ان کا اپنا رنگ و آہنگ تھا۔ ان کے انتقال سے اردو نے ایک نظم گو شاعر کھو دیا۔

ڈاکٹر عقیل احمد نے کہا کہ وہ تقریباً پچاس سال سے لندن میں مقیم تھے لیکن ان کی تحریروں سے ایسا لگتا ہے کہ وہ ہندوستان میں بیٹھ کر شاعری کر رہے تھے۔ ان کی زبان معیاری ہوتی ہے۔ ان کے انتقال سے اردو نے اپنا ایک سفیر کھو دیا۔ اس موقع پر وسیم احمد سعید نے کہا کہ ودیا ساگر آنند نے بہادر شاہ ظفر پر جو کام کیا ہے۔ وہ قابل ذکر ہے۔ انھوں نے تحقیق کر کے جو حوالے پیش کئے ہیں وہ دستاویز کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس موقع پر متین امروہوی نے منظوم اظہار تعزیت کی۔

✿✿✿

غالب اکیڈمی میں حسین احمد شیرازی کی کتاب ''بابونگر'' پر مذاکرہ اور محفل طنز و مزاح

بروز جمعہ 4/ اکتوبر 2013 شام ساڑھے پانچ بجے انڈین کلچر سوسائٹی کے زیر اہتمام غالب اکیڈمی، نئی دہلی میں لاہور کے حسین احمد شیرازی کی کتاب بابونگر پر مذاکرہ اور محفل طنز و مزاح کا انعقاد کیا گیا۔ اس موقع پر پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے بابونگر کے اجرا کی رسم ادا کی اور اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ آج کے دور میں ہر آدمی پریشان ہے۔ اس پریشانی کے دور میں طنز و مزاح کی ضرورت ہے جس سے لوگوں کو ہنسنے کا موقع ملتا ہے۔ اس موقع پر مشہور مزاح نگار مجتبیٰ حسین کا مضمون انڈین کلچر سوسائٹی کے صدر جناب نارنگ ساقی نے پڑھ کر سنایا۔ ڈاکٹر عقیل احمد نے کتاب کا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ بابونگر تین حصوں پر منقسم ہے ایک حصہ تعارفی ہے دوسرے حصے میں حسین احمد شیرازی کے مزاحیہ مضامین ہیں اور تیسرے حصے میں بابونگر عنوان سے چھوٹے چھوٹے چوالیس خاکے ہیں جو دفتروں میں کام کرنے والے مختلف افراد اور دفتری ماحول کے بارے میں لکھے گئے ہیں۔ حسین احمد شیرازی نے بابونگر میں شامل مضامین سے چند اقتباسات پیش کئے اور اپنی تقریر میں کہا کہ انسان کے ایک دوسرے کے قریب آنے اور آپس میں ملنے جلنے سے بہت سے مسائل حل ہو سکتے ہیں جبکہ

فاصلے سے بہت سی غلط فہمیاں پیدا ہوتی ہیں۔ معروف مزاح نگار اسد رضا نے اس موقع پر بولتے ہوئے کہا کہ آج کے ماحول میں ہندو پاک سرحد پر طنز و مزاح کی محفل ہونے سے کشیدگی دور ہوگی۔ اس موقع پر بزرگ مزاح نگار منظور عثمانی نے کہا کہ پنجاب کا چھٹا دریا ظرافت کا ہے بابونگر میں یہی دریا جاری ہے۔ اس موقع پر متین امروہوی، اسرار جامعی، اقبال فردوسی، شہباز ندیم ضیائی، احمد علوی نے اپنے اشعار پیش کئے۔ انڈین کلچر سوسائٹی کے سکریٹری میکش امروہوی نے مہمانان کا خیر مقدم کیا۔ اس موقع پر بڑی تعداد میں دہلی کے ادیب و شاعر موجود تھے۔ جن میں زاہد علی خاں اثر، فاروق ارگلی، معین شاداب، علیم الدین اسعدی، جے آر کنول، ظہیر احمد برنی، مشتاق صدف، محمد غلام، نسیم احمد عباسی، امیر امروہوی کے نام قابل ذکر ہیں۔

✡✡✡

غالب اکیڈمی میں 7/اکتوبر 2013 کو ''اداس نسلیں'' پر مذاکرہ

عبداللہ حسین کے ناول اداس نسلیں کی اشاعت کے پچاس سال مکمل ہونے پر غالب اکیڈمی میں ایک مذاکرہ کا اہتمام کیا گیا اس جلسہ کی صدارت نامور نقاد پروفیسر شمیم حنفی نے کی اور نظامت کے فرائض ڈاکٹر سرورالہدیٰ نے انجام دیے۔ اداس نسلیں 1963 میں شائع ہوئی تھی 2013 میں اس کتاب پر مذاکرہ کا ہونا اس بات کی علامت ہے کہ ادبی معاشرہ نے اداس نسلیں کو فراموش نہیں کیا کسی کتاب کا پچاس سال تک موضوع گفتگو رہنا اس کی داخلی قوت کی دلیل ہے۔ جلسہ کی ابتداء میں اداس نسلیں کا ایک اقتباس جناب ثاقب عمران نے پیش کیا اس کے بعد ڈاکٹر سرورالہدیٰ نے اداس نسلیں کے تاریخی اور تہذیبی تناظر پر گفتگو کرتے ہوئے اس بات پر زور دیا کہ آج بھی اس ناول کا متن کئی اعتبار سے بامعنی ہے اور آج کے لکھنے والے بھی اداس نسلیں سے یہ تو سیکھ ہی سکتے ہیں کہ بیان اور بیانیہ میں فرق کیا ہے اور یہ کہ تاریخ کے جبر سے تحریک پانے کے باوجود متن کو جبر سے کس طرح بچایا جا سکتا ہے اس کے بعد ریسرچ اسکالر عبدالسمیع نے اداس نسلیں کی مختلف اشاعتوں کا حوالہ پیش کرتے ہوئے اس ناول پر ایک تجزیاتی مقالہ پیش کیا انہوں نے نعیم کے کردار سے بحث کی اور کچھ بنیادی سوالات قائم کئے۔ جناب محمد مقیم نے ناول کا تفصیلی

مطالعہ پیش کیا اور یہ سوال قائم کیا کہ عبداللہ حسین نے جن نسلوں کو اپنا موضوع بنایا تھا اس کے بعد کی نسل اس ناول کو کیوں پڑھے اور کس طرح پڑھے۔ محمد علام الدین کا مقالہ بھی اداس نسلیں کے تفصیلی جائزہ پر مشتمل تھا انہوں نے اپنے مقالہ میں ناول کے کچھ حصوں کے فطری اور غیر فطری ارتقا سے بحث کی۔ ذاکر فیضی نے اداس نسلیں پر ایک عمومی جائزہ پیش کیا۔ ڈاکٹر عقیل احمد نے اداس نسلیں ایک تعارف کے عنوان سے مقالہ پیش کیا۔ یہاں اس بات کی طرف اشارہ ضروری کہ یہ تمام مقالہ نگار ریسرچ اسکالر ہیں اور ان سے یہ درخواست کی گئی تھی کہ براہ راست یہ اس ناول کا مطالعہ کریں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ نئے اسکالرس نے جو مضامین پڑھے وہ کئی لحاظ سے تازہ کار اور فکر انگیز تھے۔ بلراج مین را کے رسالہ شعور میں شمیم حنفی کا ایک مضمون نعیم کے کردار پر شائع ہوا تھا اسے نوشاد منظر نے پڑھ کر سنایا یہ ایک طرح کی خود کلامی ہے جو نعیم کی زبان میں ہے اس لحا ظ سے یہ تحریر تخلیقی نوعیت کی ہو گئی ہے۔ پروفیسر معین الدین جینابڑے نے ان مقالوں پر اپنی را ئے دی اور انہیں ایک خوشگوار تجربہ قرار دیتے ہوئے نعیم کے کردار کے سلسلے میں بعض نئے گوشوں کی جانب اشارہ کیا اور یہ بھی کہا کہ اداس نسلیں کا متن جہاں ختم ہوتا ہے اس کے بعد اب یہ قاری پر منحصر ہے کہ کیسے وہ اس سے کیا معنی اخذ کرتا ہے۔ پروفیسر شمیم حنفی نے اس جلسہ پر اپنی خوشی کا اظہار کیا اور اداس نسلیں کو انسانی رشتوں کے سیاق میں دیکھنے پر زور دیا۔

✿✿✿

غالب اکیڈمی میں 2 نومبر 2013 کو ادبی نشست

اردو کا سفر اب تو خلاؤں میں ہے جاری
قیدی کوئی خوشبو کو بنا بھی نہیں سکتا

غالب اکیڈمی نئی دہلی کی طرف سے ہر ماہ ایک ادبی نشست کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ جس میں تخلیق کار مضامین اور اشعار پیش کرتے ہیں۔ گزشتہ روز ماہ نومبر کی نشست کا انعقاد کیا گیا۔ جس میں سائنس کی دنیا کے سابق ایڈیٹر محمد خلیل ۔نے شور کی آلودگی کے عنوان سے ایک معلوماتی مضمون پڑھا۔ جس میں شور سے ہونے والے نقصانات اور ان کے تدارک پر روشنی ڈالی گئی۔ نشست کی

صدارت متین امروہی نے کی۔ عقیل احمد نے شکرہ ادا کیا۔ منتخب اشعار پیش خدمت ہیں۔

نہ آئے ہاتھ اس کے جب پہنچ سے دور ہوتا ہے تو کھٹا لومڑی کے لئے انگور ہوتا ہے (قیصر عزیز)

زندگی یوں گزر گئی جیسے دھوپ چھت سے اتر گئی جیسے (عبدالرحمان منصور)

پیاری اردو ترا معیار گرانے کے لئے شعر کہتا ہے میں یہ کچھ کمانے کے لئے (فینس کھتولی)

شعور دیکھتے بنتا ہے بس دیوانے کا خرد تو ہاتھ میں پتھر اٹھائے پھرتی ہے (الیس یوظفر)

میں یہ کہتا ہوں آ زمین پہ مل وہ یہ کہتا ہے آ آسمان میں آ (شہباز ندیم ضیائی)

دیکھیں فصیل شہر میں اک بار جھانک کر گوشہ نشیں ہیں کتنے ہی فن کلاک طرف (احمد علی برقی)

اردو کا سفر اب تو خلاؤں میں ہے جاری قیدی کوئی خوشبو کو بنا بھی نہیں سکتا (اسرار رازی)

بلا کی پیاس کے منظر تھے کربلا والے ہمارے ذکر سے ہی ہونٹ سوکھ جاتے ہیں (درد دہلوی)

مل جائے کہیں سورج تو اس کو بتا دینا مغرب میں اجالا ہے مشرق میں اندھیرا ہے (انا دہلوی)

عظمت کا اپنی سکہ جمائے ہوئے تو ہیں ہم دشمنوں کے ذہن پہ چھائے ہوئے تو ہیں (نسیم عباسی)

میں نے پڑھ کر نظر کی یہ آیت آج اس کی نظر اتاری ہے (متین امروہوی)

❀❀❀

غالب اکیڈمی میں سردار جعفری کی شعری روایت پر ڈاکٹر خالد علوی کا اظہار خیال

18 دسمبر 2013 کو غالب اکیڈمی نئی دہلی میں سردار جعفری کی پیدائش کے سو سال پورے ہونے پر ایک جلسے کا اہتمام کیا گیا جس میں ڈاکٹر خالد علوی نے سردار جعفری اور ہماری شعری روایت کے عنوان سے ایک خصوصی لیکچر دیتے ہوئے کہا کہ سردار جعفری نے پہلی بار مارکسی نقطہ نظر سے غالب کا مطالعہ کیا اور غالب کے بارے میں لکھا کہ غالب عبوری دور کا شاعر تھا۔ اس کی خاصیت اس کا شکوہ اور عظمت ہے اور اس کی متحرک امیجری ہے، غالب انسانی عظمت کا شاعر ہے۔ ڈاکٹر خالد علوی نے کہا کہ سردار جعفری کے رویئوں میں ارتقا ہے، رفتہ رفتہ توازن پیدا ہوتا ہے۔ اردو میں کبیر پر مطالعے کی ابتدا سردار جعفری نے کی۔ کبیر کے بارے میں سردار جعفری نے کہا

کہ کبیر کے یہاں ہندو بھگتی اور تصوف کا حسین امتزاج ملتا ہے۔کبیر ہندی کا پہلا بڑا شاعر تھا۔اقبال کے بارے میں سردار جعفری نے کہا کہ وہ اردو کے سب سے بڑے شاعر تھے۔اقبال کی شاعری میں اصل حسن موضوع ہے۔اقبال نے انسان کی پزیرائی کی۔اقبال کی شاعری عالم انسانیت کی بیداری کی شاعری ہے۔میر کی شاعری کے بارے میں سردار جعفری نے لکھا ہے کہ میر کی شاعری سادہ دلنشیں بھی ہے اور ٹیڑھی بھی۔میر نے زندگی کو خوشبو سے تشبیہ دی ہے۔اس موقع پر پروفیسر شمیم حنفی نے اپنی تقریر میں کہا کہ سردار جعفری شروع میں آزاد نظم کے مخالف تھے بعد میں نظمیں لکھیں، اپنا محاسبہ کرتے رہے وہ بہت سرگرم تھے، کبھی نوکری نہیں کی، ان کے سامنے ایک آدرش تھا، زندگی کو بدلنا چاہتے تھے ان کی خدمات غیر معمولی رہی ہیں۔اس موقع پر پروفیسر سلیل مسرا نے صدارتی تقریر کرتے ہوئے کہا کہ سردار جعفری نے تصور عشق اور تصور انقلاب کو بڑی خوبی کے ساتھ اپنی شاعری میں استعمال کیا ہے۔انھوں خاص طور سے سردار جعفری کی شاعری میں ہندوستانی روایت کا ذکر کیا۔اس موقع پر ڈاکٹر عقیل احمد نے کہا کہ سردار جعفری کی شخصیت عظیم تھی اس کے کئی پہلو تھے۔وہ ایک ترقی پسند شاعر اور نقاد تھے۔وہ ایک خطیب و ادیب تھے۔دانشور اور سماجی کارکن بھی تھے۔بچپن میں انیس اور اقبال کی شاعری سے متاثر ہوئے، گھر کی مجلسوں کے مقرر تھے، لکھنؤ علیگڑھ اور دہلی کالج سے تعلیم حاصل کی، انگریزوں کی مخالفت کی وجہ سے لکھنؤ اور علی گرھ سے نکالے گئے۔کئی بار جیل گئے، جوش کے ساتھ نیا ادب کے مدیر بھی رہے۔ان کی پہلی تخلیق منزل افسانوں کا مجوعہ ہے۔ان کے نو شعری مجموعے اردو کے ساتھ ساتھ کئی زبانوں میں شائع ہوئے وہ پدم شری اور گیان پیٹھ جیسے اعلی ایوارڈ سے سرفراز ہوئے۔میر اور غالب کے دیوان کو ہندی میں عام کیا۔اس موقع پر متین امروہوی نے اپنا منظوم کلام پیش کیا۔

✿✿✿

مطبوعات غالب اکیڈمی

نام کتاب	مصنف/مترجم	قیمت
دیوانِ غالب (ہندی)		100/-
دیوانِ غالب عام ایڈیشن	غالب اکیڈمی	100/-
یادگار غالب فارسی متن کے ترجمے	الطاف حسین حالی	450/-
دیوان غالب ڈیلکس		200/-
شرح دیوان غالب اردو	قاضی سعید الدین علیگ	250/-
اقبال کی منتخب نظمیں غزلیں تنقیدی مطالعہ	پروفیسر اسلوب احمد انصاری	150/-
تفتہ اور غالب	ڈاکٹر محمد ضیاء الدین انصاری	35/-
شرح دیوان غالب (ہندی)	نسیم احمد عباسی	550/-
غالب اور فن تنقید	اخلاق حسین عارف	25/-
تصورات غالب	محمد عزیز حسن	35/-
انشائے مومن	پروفیسر ظہیر احمد صدیقی	25/-
مومن شخصیت اور فن	پروفیسر ظہیر احمد صدیقی	300/-
ہندوستانی رنگ	پروفیسر محمد حسن	75/-
نوائے سروش (انگریزی)	غالب اکیڈمی	40/-
اقبال/مضامین مقالات	پروفیسر اسلوب احمد انصاری	95/-
جنوب مغرب ایشیا میں رابطے کی زبان	پروفیسر محمد حسن	75/-
رقص شرر	انّ میری شمل (قاضی افضال حسین)	90/-
اردو غزل کے اہم موڑ	شمس الرحمان فاروقی	150/-
تلمیحات غالب	محمود نیازی	90/-
جہات غالب	ڈاکٹر عقیل احمد	200/-
حکیم عبدالحمید شخصیت اور خدمات	ڈاکٹر عقیل احمد	150/-
مطالعات خطوط غالب	حکیم عبدالحمید	150/-
مطالعات کلام غالب	حکیم عبدالحمید	600/-
نشاط غالب	وجاہت علی سندیلوی	150/-
اقبال اور عصر حاضر کا خرابہ	پروفیسر شمیم حنفی	150/-
مزار غالب (اردو)	شمس بدایونی	100/-
مزار غالب (ہندی)	شمس بدایونی	100/-
غالب اور اقبال کی متحرک جمالیات	یوسف حسین خاں	200/-

राष्ट्रीय उर्दू भाषा विकास परिषद
قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
National Council for Promotion of Urdu Language
M/o HRD Dept. of Higher Education, Govt. of India
Faroghe-e-Urdu Bhawan
FC.33/9.Institutional Area, Jasola, New Delhi-110025, Ph:49539000
Fax: 011-49539099 Email:urducouncil@gmail.com

قومی اردو کونسل کے سہ ماہی مجلّے فکر و تحقیق کا نیا افسانہ نمبر ہم عصر افسانے کی ایک دستاویز: ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین

قومی اردو کونسل برائے فروغ اردو زبان کے سہ ماہی مجلّے فکر و تحقیق کا نیا افسانہ نمبر (اکتوبر تا دسمبر 2013) ایک ہفتے میں منظر عام پر آنے والا ہے۔قومی اردو کونسل کے صدر دفتر میں شمارے سے متعلق ایک اہم میٹنگ میں اظہار خیال کرتے ہوئے کونسل کے ڈائرکٹر اور رسالے کے مدیر ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین نے کہا کہ فکر و تحقیق کا یہ شمارہ ایک دستاویزی شمارہ ہوگا اور اس شمارے کے بعد نئے افسانے پر گفتگو کے در وا ہوں گے۔اس شمارے میں ہم نے ملک کے مختلف حصوں سے نامور ادبا اور اسکالروں کے ہم عصر افسانے پر لکھے گئے مضامین کو جگہ دی ہے۔اس شمارے کی ایک اہم خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں نہ صرف اہم ناقدین کے مضامین ہیں بلکہ ملک کے اہم فکشن نگاروں کے مضامین کو بھی شامل کیا گیا ہے۔تقریباً 700 صفحات پر مشتمل یہ شمارہ فکر و تحقیق کا اب تک کا سب سے ضخیم شمارہ ہوگا لیکن اس کی قیمت عام شمارے کے برابر ہی رکھی گئی ہے۔شمارے میں ایک تحریری مباحثہ بھی شامل کیا گیا ہے۔

واضح ہو کہ ادھر کونسل نے جہاں اردو کے فروغ سے متعلق کئی اہم اور نمایاں کام انجام دیے ہیں وہیں بچوں کے لیے ایک شاندار رسالہ بچوں کی دنیا کا بھی آغاز کیا ہے۔ماہنامہ اردو دنیا میں بھی لگاتار نئے اور اہم موضوعات پر مضامین شائع ہو رہے ہیں۔گوشہ ابن صفی، گوشہ علی سردار جعفری، ادب مذہب اور اردو، علاقائی زبانیں اور اردو، اردو میں بچوں کا ادب، مدارس میں اردو، سائبر اسپیس میں اردو، ہندوستانی آئین اور اردو، اقلیتوں کی تعلیم سے متعلق موضوعات پر نہایت وقیع مضامین شائع ہوتے رہے ہیں۔اسی طرح پچھلے ایک سال میں فکر و تحقیق نے گوشہ میرا جی کے علاوہ منٹو نمبر اور نئی غزل نمبر شائع کیے ہیں جو ادب کے طلبا اور ناقدین نے حد درجہ پسند کیا۔ اب سال کے آخر میں ادب نوازوں کے لیے یہ نیا افسانہ نمبر ایک خوصورت تحفہ ہوگا۔

✿✿✿
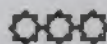
نیا افسانہ نمبر
فکر و تحقیق
سہ ماہی
FIKR O TAHQEEQ
Vol XVI
Iss. 4
قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی